پتھر چہرے
(افسانے)
سیّد گلزار حسنین

سیّد گلزار حسنین ضلع اوکاڑہ (پنجاب) کے گاؤں مصطفیٰ آباد کے سادات گھرانے میں 1958ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم لاہور سے حاصل کی، میٹرک تک سنٹرل ماڈل اسکول لوئر مال لاہور میں پڑھے۔ ایف سی کالج سے ایم اے معاشیات کیا۔ 1985ء میں سی ایس ایس کرنے کے بعد پاکستان سول سروس سے منسلک ہو گئے اور حکومت کے مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ دنیا کے تقریباً پینتالیس (45) ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ اکاؤنٹنٹ جنرل آزاد جموں و کشمیر و اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان رہنے کے علاوہ ڈائریکٹر جنرل آڈٹ فیڈرل گورنمنٹ تعینات رہے۔ آج کل "وزارت بین الصوبائی رابطہ" میں فرائض ادا کر رہے ہیں۔

ادب، تاریخ اور فلسفہ اُن کے مطالعے کے خاص میدان ہیں، ادبی زندگی کا آغاز سفرنامے سے کیا بعد ازاں افسانے لکھے۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

پتھر چہرے
(افسانے)

سیّد گلزار حسنین

نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

نگران : ڈاکٹر انعام الحق جاوید

مصنف : سیّد گلزار حسنین

اشاعتِ اول : نومبر، 2016ء (تعداد:1000)

اشاعتِ دوم : دسمبر، 2017ء (تعداد:2000)

کوڈ نمبر : GNU-620

آئی ایس بی این : 978-969-37-1013-7

طابع : ملٹی کلرز، اسلام آباد

قیمت : -/160 روپے

نیشنل بک فاؤنڈیش کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:

ویب سائٹ: http/www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261125

یا ای میل: books@nbf.org.pk

انتساب

والدِ مرحوم

سیّد عاشق حسین

کے نام

فہرست

پیش لفظ

(۱)

نیشنل بک فاؤنڈیشن کا مقصد قارئین کو مفید، معلوماتی اور علمی کتب کے ساتھ ساتھ ایسی کتابیں فراہم کرنا ہے جو ان کے ادبی ذوق کی بھی آبیاری کر سکیں چنانچہ اس ضمن میں منتخب ادبی شہ پاروں کے ساتھ ساتھ اہلِ قلم کی ادبی تخلیقات کو بھی منظرِ عام پر لایا جا رہا ہے۔ افسانوں کی یہ کتاب ''پتھّر چہرے'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اس کتاب کے مصنف گلزار حسنین یوں تو اس وقت حکومتِ پاکستان کے ایک اعلیٰ عہدیدار ہیں مگر علم و ادب سے ان کا دیرینہ رشتہ ہے جو ان کی ادبی تخلیقات کے پس منظر میں واضح طور پر جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کی تخلیقات قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین کر چکی ہیں اور نیشنل بک فاؤنڈیشن سے بھی ان کے افسانوں کی کتاب ''چُھپے ہاتھ'' شائع ہو چکی ہے جس کا دوسرا ایڈیشن نکل چکا ہے تاہم موجودہ کتاب میں شامل کہانیاں مختلف موضوعات اور تاریخی پس منظر میں لکھی گئی ایسی خصوصی تحریریں ہیں جو اپنی بُنت اور اندازِ بیان کی انفرادیت کے باعث قاری کو شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہیں۔ گلزار حسنین صاحب بخوبی جانتے ہیں کہ کہانی کہاں سے شروع کرنی ہے، کہاں ختم کرنی ہے اور کیسے ختم کرنی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر کہانیوں کا اختتام ایسے منفرد انداز میں ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں میں کہانی کا آغاز خود بخود منعکس ہوتا چلا جاتا ہے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں تفصیلات و جزئیات کی بجائے ایجاز و اختصار کی کیفیت پائی جاتی ہے جس کے باعث انہیں حقیقی طور پر شارٹ اسٹوریز کہا جا سکتا ہے۔

امید ہے قارئین کو یہ افسانوی مجموعہ بھی ان کے پہلے افسانوی مجموعے کی طرح پسند آئے گا۔

(۲)

مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ایک سال کی مدت میں ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے جب کہ قیمت بھی 190 روپے سے کم کر کے 160 روپے کر دی گئی ہے تا کہ یہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچ سکے۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(پرائڈ آف پرفارمنس)
مینیجنگ ڈائریکٹر

دیباچہ

کوشش کے باوجود میں تقریباً چودہ سال کچھ نہ لکھ پایا۔ کوشش بھی فقط سوچ تک محدود رہی۔ سوچ آتی رہی کہ وقت گزر رہا ہے، گزرتا جا رہا ہے اور میں لکھنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں پا رہا۔ لمبا عرصہ گزر گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھی گزر جاؤں کچھ اور لکھے بنا۔ گزرے وقت کے ساتھ انسان کو بھی گزر جانا ہوتا ہے اور اسی مجبوری اور کمزوری نے آدمی کو بہت کمزور کر دیا ہے۔ خصلتاً اور فطرتاً۔ اس کمزوری پر قابو پانے کے لیے وہ دولت، اقتدار، طاقت، جبروت اور ظلم کا سہارا لیتا ہے۔ اس طرح انسان خود پسندی، لالچ اور کم ظرفی کے غار میں اترتا چلا جا رہا ہے۔

درحقیقت ہر کہانی انسان کی کہانی ہے اور ہر افسانہ انسانی زندگی کا آئینہ۔ جس کہانی اور افسانے میں انسان کی سوچ، جبلّت اور فطرت عریاں ہوتی نہ دیکھی جائے وہ افسانے کی بجائے پہیلی ہوسکتی ہے افسانہ نہیں۔ تخیل کی پرواز کو حقیقت پسندی اور اصلیت کے آسمان اور فضا سے باہر نہیں ہونا چاہیے۔ چند حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو ابھی انسان پر عیاں نہیں ہوئی ہوتیں، مگر قدرت انہیں وجود میں لا چکی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے تخیل جتنا ہی اپنے تئیں غیر حقیقی دنیا میں پہنچ جائے، وہ حقیقت سے باہر نہیں ہوسکتا کیونکہ جو شے ذہن میں سما جائے، جسے تخیل کے پَر لگ جائیں، جو احساس کی زد میں آجائے وہ کہیں نہ کہیں وجود رکھتی ہے چاہے ماورائے شعور۔

زندگی کی بہت ساری حقیقتیں ایسی ہیں کہ وہ ہمارے سامنے واقع ہو رہی ہوتی ہیں، مگر ہم ان کا احساس نہیں کرتے۔ قدر نہیں جانتے اور بعد میں یہی احساس، یاس اور حسرت بن کر زندگی کے ساتھ جاتا ہے۔ زندگی کے عام واقعات کو تخیلاتی نفاست اور منظر نگاری کے اوصاف سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو افسانے وجود میں آتے ہیں۔ بڑا ادب وہ ہے جو انسان کو اپنے آپ سے

ملنے کا موقع فراہم کرے، جہاں قاری اپنا ادراک کر سکے، جہاں وہ خود کو پرکھ سکے، اپنی فطرت اور جبلّت کے اچنبھے میں جھانک سکے۔ چند افسانے تاریخ سے لیے۔ صدیوں پر محیط مظالم اور ناروا اجارہ داریوں پر تنقید اور ملامت کی غرض سے۔ شاید ظلم پر ردِعمل کرنے میں انسانی سوچ اور کردار کو مائل کیا جا سکے، شاید مظلوم کی دادرسی کی کوشش کو انسانی فطرت تسلیم کرے اور ذاتی نفع ونقصان سے ماورا ہو کر کوئی منظم جدوجہد وجود پا جائے۔

سید گلزار حسنین
07 ستمبر 2016ء
اسلام آباد

جاگنگ ٹریک

لگا تار ایک مہینہ پارک میں آنے کے بعد میں اس ماحول سے کافی مانوس ہو چکا تھا، جو شروع شروع میں میرے لیے کوفت اور بیزاری پیدا کر دیتا تھا۔ اب ناغہ کرنے کو کبھی جی نہ چاہتا۔ پارک میں چند ایک کلاس فیلو بھی کبھی کبھی مل جاتے مگر اُن کی ملاقات میں باقاعدگی نہیں تھی اور نہ وہ ملاقات طویل دورانیے کے لیے ہوتی بس دور سے سرسری سلام دعا تھی۔ میرا سیر کا وقت ایسا تھا جب سورج اپنی آخری سانسوں پر ہوتا اور دن بھر کی مسافت کی وجہ سے اُس کا چہرہ تھکن سے سُرخ ہو چکا ہوتا۔ بیشتر پرندے، جو اُس پارک میں موجود گھنے درختوں کے رہائشی تھے، رزق کی تلاش میں شہر کی گلی گلی پھرنے کے بعد درختوں پر پلٹ آتے اور مل کر وہ شور وغل کرتے کہ بعض اوقات کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ زیادہ شور چڑیوں اور کوؤں کا ہوتا۔ میں نے کئی دفعہ وہاں سے گزرتے ہوئے سوچا کہ یہ اتنا شور کس بات پر کر رہے ہیں کُچھ تو اس کا سبب ہوگا۔ بے شک وہ وجہ اور مقصد ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ کبھی کبھی جب ابھی دھوپ باقی ہوتی، جھیل کے ساتھ چھوٹے ٹیلے کے اوپر کوئے اور چیلیں ڈوبتے سورج کی طرف منہ کیے آرام سے بیٹھے نظر آتے۔ جیسے ہی دھوپ غائب ہوتی، وہ بھی پرواز کر جاتے۔

گرمیوں کے موسم میں پارک میں سیر کرنے والوں کی تعداد بڑھ جاتی۔ مختلف عُمر کی عورتیں، مرد اور بچے تیز چلتے، ایک دوسرے سے بے نیاز روشوں پر رواں دواں رہتے۔ نوجوان چلنے کی بجائے اکثر دوڑتے ہوئے گزر جاتے۔ تھکن اُن کے چہروں پر عیاں نہ ہوتی۔ بلکہ پسینے کے سبب اُن کے چہروں پر چمک پیدا ہو جاتی جو اُن کی جوانی کی غمازی کرتی تھی۔ میرے اپنے چہرے پر بھی پسینے کی وجہ سے اسی قسم کی چمک پیدا ہو جاتی لیکن اپنے سے کم عمر نوجوانوں سے کم۔

کچھ مرد و زن چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر چلتے۔سب سے منفرد اور بڑا گروہ سات آدمیوں پر مشتمل تھا۔تمام عمر رسیدہ لیکن بظاہر صحت مند۔یہ خراماں خراماں چلتے مسلسل گفتگو کئے جاتے۔ معلوم ہوتا،انہیں چل قدمی سے زیادہ گفتگو سے دلچسپی ہے۔دو قطاریں بنائے آگے پیچھے رہتے اور باتیں کئے جاتے۔اگر روش پر سامنے سے کوئی آ رہا ہوتا تو اُس کے لیے راستہ چھوڑ کر ایک قطار بنا لیتے اور باتوں کا تسلسل نہ ٹوٹنے دیتے۔کچھ دیر روش پر چلنے کے بعد قریب کے کسی بنچ پر بیٹھ جاتے،کچھ دیر سستانے اور ایک دوسرے کو مذاق کرنے کے بعد دوبارہ روش پر آجاتے۔اُن میں سے ایک بزرگ عجیب سے حلیے کا تھا۔اکثر سفید شرٹ،اُسی رنگ کی پتلون اور سفید ہی جوتے پہنے رکھتا۔قد درمیانہ تھا۔تیلی تیلی ٹانگیں اور بڑھا ہوا پیٹ۔سفید شرٹ پیٹ پر تنگ ہوتی۔عمر ستر سال ہوگی۔

پہلی دفعہ جب میری اُس پر نظر پڑی تو ایسے لگا جیسے وہ پچھلے جنم میں مچھلی رہا ہوگا۔میرے منہ سے فوراً نکلا،"مچھلی نما انسان"۔مجھے اس عجیب خیال کی کوئی خاص وجہ سمجھ نہ آئی۔شاید تیلی ٹانگوں اور بڑے پیٹ کو دیکھ کر میرے ذہن میں وہ نامعقول تصور آیا۔چہل قدمی کرتے ہوئے ان سے دو دفعہ آمنا سامنا ہوتا۔میری نظر سب سے پہلے اُسی مچھلی نما انسان پر پڑتی۔اُن کا ایک اور ساتھی بھی کچھ عجیب سا تھا۔لمبی سفید داڑھی اور لمبے بال کندھوں تک بکھرے ہوئے تھے۔وہ بھورے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی شلوار پہنے رکھتا۔سردیوں کے دنوں میں اُسی رنگ کی اونی چادر سے خود کو لپیٹے رکھتا۔اُسے میرے ذہن نے کسی دور اُفتادہ جنگل کے کنارے پر واقع اُجاڑ مندر کا پروہت بنا دیا۔ایسے مندر کا،جس کے پجاری آلامِ زمانہ کے سبب وہ گاؤں یا علاقہ چھوڑ گئے ہوں اور اب اُس کا واحد نگہبان اور پجاری وہ سفید داڑھی اور لمبے بکھرے بالوں والا پروہت رہ گیا ہو،جس کے ایمان اور وابستگی نے اُسے مندر سے بے وفائی نہ کرنے دی۔کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ میں اس پروہت کے متعلق سوچتا اور میرا ذہن پارک سے نکل کر ویران مندر اور اس کے اردگرد واقع وسیع اور گھنے جنگل کی سیر کو نکل جاتا۔جہاں مندر سے کچھ فاصلے پر واقع ایک بلند چٹان سے بہتے

چشمے کا پانی کچھ دیر اس سنگلاخ سیاہی مائل چٹان پر بہنے کے بعد نیچے اس کے پتھریلے دامن میں گر رہا تھا۔ ان پتھروں پر بلندی سے اس آبشار کے گرنے کا مسلسل شور اور سیال چاندی کے دور دور تک جاتے چھینٹے۔ پھر وہ پانی بہتا ہوا مندر کے پہلو میں بنی ایک جھیل میں جمع ہوتا۔ وہ جھیل بہت بڑی نہ تھی تقریباً پانچ ایکڑ رقبے پر محیط تھی اور پھر ایک ندی کی صورت کہیں جنگل میں ہی چھپ جاتی۔ جھیل سے کچھ فاصلے پر اس گاؤں کے گھروں کے نشانات تھے جن کے رہائشیوں نے وہ مندر تعمیر کیا ہوگا۔ مدتوں وہاں دیوی دیوتاؤں کے بھجن گائے گئے، پرشاد بانٹے گئے، دنیا کی محرومیاں چھٹنے کے لیے یاتری مناجات کرتے رہے۔ مرادیں پوری ہونے پر ڈھول اور ناقوس کی آوازیں جنگل میں دور دور تک سنائی دیتیں جب کوئی اپنی منت اتارے مٹھائی اور حلوہ شکرانے کے طور پر دیوی کے قدموں میں رکھنے آتا۔ پجاری اور آئے ہوئے یاتری اسی جھیل کے شفاف پانی سے اشنان کرتے۔ مندر کے در و دیوار پر سبزا نکل آیا تھا۔ جھیل کے ساتھ بنی پتھر کی سیڑھیوں کو بھی جنگلی پودوں اور بیلوں نے کافی حد تک ڈھانپ لیا تھا اور ان سیڑھویں نے شاید کافی مدت سے کسی پجاری یا یاتری کے پاؤں کا لمس محسوس نہ کیا ہوگا جو یہاں اشنان کرنے یا جسمانی پاکی کے بعد مندر میں دیوتاؤں کے قدموں میں جھکنے کے لیے اپنے کو تیار کرنے ان سیڑھیوں پر چلا کرتے ہوں گے۔

اب فقط رینگتے حشرات الارض تھے یا کبھی کبھی جنگلی جانور پانی پینے ادھر آتے تو چند سیڑھیوں تک بھی آ جاتے۔ اس گاؤں میں اب کچھ بھی باقی نہ تھا۔ ہاں گلیوں کے نشانات موجود تھے بل کھاتی گلیاں اب بھی تھیں۔ مکانات کی چھتیں اور گھروں کے کواڑ نہ تھے مگر کھڑی اور گری دیواریں گلیوں کی موجودگی کا سبب تھیں۔ ایک جگہ پر گاؤں کے مرکزی تنور کے نشانات تھے۔ میرا ذہن بے دھڑک ان تمام جگہوں پر پھرتا رہتا کئی دفعہ ہرنوں کی ڈاروں کے درمیان چلا جاتا جہاں کچھ فاصلے پر دھوپ میں لیٹے شیر اشتیاق سے ہرنوں کی جانب دیکھتے نظر آتے۔ درختوں پر بندروں اور لنگوروں کی اچھل کود اور مستیاں، جب ذہن اس اجاڑ مندر، جنگل جھرنے اور جھیل کی سیر کے

بعد واپس پارک آتا تو کئی دفعہ یہ سوال ساتھ لے کر آتا کہ یہ پروہت کب کا یہاں سیر کرنے آتا ہے، کیا اس نے مندر کو خیر باد کہہ دیا ہے یا رات واپس مندر چلا جاتا ہے۔ اکثر اس تخیلاتی سوال وجواب پر میں مسکرا دیتا۔

اُن کا گروپ لیڈر ایک لمبا آدمی تھا۔ متناسب جسم، نفیس لباس پہنتا اور ہاتھ میں ایک چھڑی ہوتی۔ وہ کوئی زمیندار تھا کیونکہ اکثر اپنی فصلوں، گھوڑوں اور گائے بھینسوں کے قصے دوستوں کو سناتا ہوا چلا جاتا۔ اُس کی کاشتکاری غالباً اُس کے بیٹوں نے سنبھال رکھی تھی۔ اس لیے کہ جو واقعات سناتا وہ گزرے وقتوں کے تھے۔

میں کئی دفعہ اس گروہ کے پیچھے پیچھے چلتا لاشعوری طور پر اُن کے تعاقب میں ہو جاتا۔ کبھی اُنہیں کی رفتار سے تھوڑا سا پیچھے رہتا اور کبھی آگے نکل کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے چلتا اور ان کی گفتگو سنتا جاتا۔ وہ اپنی جوانی، ملازمت، کاروبار، بچوں اور پوتوں کے بارے میں باتیں کیا کرتے۔ میری ان سے اس دوران کبھی علیک سلیک نہ ہوئی۔ یونہی دو سال گزر گئے۔ البتہ پارک میں دوسرے کئی لوگوں سے جان پہچان ہوگئی تھی۔ جس سے مجھے یہ پتا چل گیا کہ پارک میں چہل قدمی کے معاملے میں کون کتنا پابند ہے۔ ایک دن وہ سب غائب تھے ان کے مقررہ وقت پر پارک میں کوئی نہ آیا۔ میں نے سوچا شاید انہوں نے باہم مشورہ کر کے وقت بدل لیا ہو۔ یا کہیں اور چلے گئے ہوں۔ دوسرے دن جب ان بزرگوں کا گروہ سامنے سے آتا نظر پڑا تو مچھلی نما انسان دکھائی نہ دیا۔ میں نے سوچا شاید اسے کوئی کام پڑ گیا ہے یا طبیعت خراب ہوگئی ہوگی۔ نجانے میرے ذہن نے خود ہی کیوں اس کے معاملے میں یہ توجیہہ گھڑ لی تھی۔ اگلے دن بھی وہ نظر نہ آیا بلکہ وہ پھر مجھے کبھی وہاں نظر نہ آیا۔ قریباً ہفتہ تک میری نظریں اُس کی متلاشی رہیں پھر میں نے خیال کیا، وہ انتقال کر چکا ہے۔ کچھ عرصے بعد وہ اُجاڑ مندر کا پروہت بھی غائب ہوگیا۔ اسے موجود نہ پا کر میں مغموم سا ہوگیا۔

ان لوگوں کے ساتھ میری ایک قسم کی دور ہی دور سے وابستگی ہوگئی تھی۔ جب پروہت کو ایک

ہفتہ تک نہ دیکھا تو میں نے ایک دن ان کے پاس سے گزرتے ہوئے سلام کر دیا جس کے جواب میں وہ ایک دم سب بول اٹھے، وعلیکم سلام، میں نے پروہت کے نہ آنے کی وجہ دریافت کی تو اُس زمیندار نے تاسف سے جواب دیا کہ اس کا انتقال ہوگیا ہے۔

"اوہ، مجھے بڑا افسوس ہوا،" میں نے متوقع جواب پا کر جان بوجھ کر ایک اضطراری سی کیفیت بنا کر کہا۔ "انہیں کیا ہوا؟"

کچھ خاص نہیں ہوا برخوردار، وہی لمبا آدمی مسکرا کر بولا، جس عمر کے حصے میں ہم ہیں، وہاں سے دوسرے جہاں کو جانے کے لیے کسی خاص وجہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس معمولی بہانہ کافی ہوتا ہے۔ جیسے کسی درخت کا زمین پر گرا خشک پتہ معمولی ہوا کے دوش اڑ کر کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے۔ خدا اُن کی مغفرت کرے، اور میں قدم بڑھا کر آگے نکل گیا۔

اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد مجھے ملازمت کے سلسلے میں ملک سے تین سال تک باہر رہنا پڑا۔ جب واپس آیا تو ایک ہفتہ تک کچھ مصروفیت رہی اور میں پارک نہ جا سکا۔ اس کے بعد پھر باقاعدگی سے جانے لگا۔ پارک میں داخل ہوتے ہی مجھے سب سے پہلا خیال اُن بزرگوں کا آیا۔ میں اُن کو دیکھنا اور اُن کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دور سے آتے نظر آئے۔ حسب معمول ان کا لمبا لیڈر سب سے آگے تھا۔ قریب آنے پر میں نے پہلی بار رک کر ان سے ملنا چاہا، لیڈر نے پہلے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ پھر شفقت سے گلے لگا لیا، آپ کافی مدت کے بعد نظر آئے۔ مجھے فکر لاحق ہوگئی تھی، حالانکہ ابھی تک میں آپ کا نام بھی نہیں جانتا۔

میں نے جواب دیا، میں ملک سے باہر چلا گیا تھا (پھر ہنستے ہوئے) ویسے بھی ایک دفعہ اپنے ساتھی کی وفات پر آپ نے کہا تھا کہ اس عمر میں مرنے کے لیے خاص وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی اور میں ابھی اس عمر کو نہیں پہنچا۔ میری اس بات پر ہم دونوں مسکرا دیے۔ اس کے بعد میں نے اس کے باقی ساتھیوں سے ہاتھ ملایا۔ لیکن ان میں اس کے پرانے ساتھیوں میں سے ایک بھی نہیں تھا۔ یہ سب لوگ زمیندار کے ساتھ ان سابقہ تین سالوں میں شامل ہوئے تھے۔

کافی عرصہ گزر چکا ہے اس زمیندار لیڈر کو بھی یہ دنیا چھوڑے ہوئے، لیکن عمر رسیدہ لوگوں کا ایک گروہ آج بھی قائم تھا۔ اب ان کا قائد ایک نیم فربہ درمیانے قد کا تقریباً 65 سالہ آدمی تھا۔ میں پچھلے چند دنوں سے محسوس کر رہا تھا وہ لوگ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ نجانے کیوں میں وہ بات ان سے سننا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دن تو میں ان سے کترا کر گزر جاتا۔

ایک دن انہوں نے مجھے روک ہی لیا اور کہا، ''جناب اب آپ جس حصہ عمر میں ہیں اس میں اکیلے چہل قدمی کرنا بوریت کا باعث بھی ہے اور غیر محفوظ بھی۔ سانسوں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ اگر آپ ہمارے ساتھ شامل ہونا مناسب سمجھیں تو ہمیں خوشی ہوگی۔ میں نے ان کی بات مان لی تھی۔ پسینے سے شرابور مسکراتے اور چمکتے چہروں والے نوجوان بھاگتے ہوئے ہماری طرف دیکھتے گزر جاتے ہیں۔ جیسے بھاگتا ہوا وقت گزر گیا۔ میں کئی دفعہ سوچتا ہوں ان جوان لوگوں کے ذہن میں میرا تصور کیا ہوگا۔ مچھلی نما انسان یا پروہت۔

باغی

نومبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ شام ڈھلے سردی میں اضافہ ہو جاتا۔ سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ دریا کے پانیوں کی روانی پرسکون ہو گئی تھی۔ جوانی گزر جانے کے بعد انسان کی مانند۔ پانی اب گدلا نہیں تھا۔ کنارے کے ساتھ تیرتی مچھلیاں کنارے سے صاف نظر آتی تھیں۔ دریا ایک سیدھی لکیر کی طرح دور تک چلا گیا تھا۔ کشتی رسّے سے بندھی ہلکے ہچکولے کھا رہی تھی اور رسہ جھونپڑی کے ساتھ زمین میں گاڑے کھونٹے سے بندھا تھا۔ جھونپڑی کے دونوں طرف موجود تناور درختوں پر پرندوں کے جھنڈ اترنا شروع ہو گئے تھے۔ سفید بگلے نمایاں تھے۔ دریا کے وسط میں جہاں ڈوبتے سورج کا عکس نہا رہا تھا، وہاں خوش رنگ مرغابیوں کا ایک بڑا جھنڈ اطمینان سے تیر رہا تھا۔ اس بوڑھے ملاح کی نگاہیں ان مرغابیوں پر مرکوز تھیں۔ اس کے ذہن میں اچانک سوال ابھرا کہ دریا کے بہتے پانی میں یہ مرغابیاں بہتی ہوئی نیچے کی جانب پانی کے سنگ کیوں نہیں چلی جاتیں۔ ایک ہی جگہ کیسے رکی ہوئی ہیں۔ خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آواز نے اس کی توجہ مرغابیوں سے ہٹا دی۔

اس نے گردن گھما کر دیکھا ایک ادھیڑ عمر شخص اس کی طرف آ رہا تھا۔ ''شام ہو رہی ہے یہ شخص کون ہو سکتا ہے''۔ وہ زیرلب خود سے مخاطب ہوا۔ اُس کے قریب آنے پر وہ چارپائی سے کھڑا ہو کر اُس سے ملا اور اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تم ملاح ہو۔ اگر میں غلط نہیں'' آنے والے آدمی نے چارپائی پر بیٹھنے کے بعد اس سے سوال کیا۔

''جی ہاں! میں ملاح ہوں اور یہ کشتی میری ہی ملکیت ہے''۔ اس نے ہاتھ سے کشتی کی طرف

اشارہ کیا۔

''میں دریا کے اس پار جانا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے لے جاؤ گے''

''اس وقت تو میرے لیے آپ کو دریا پار کروانا ممکن نہیں ہے۔ تھوڑی دیر ہی پہلے میں واپس اس کنارے پر آیا ہوں۔ اب کچھ عمر بھی ایسی ہے کہ تھکاوٹ ہڈیوں میں اتر جاتی ہے۔ پھر آپ اکیلے ہیں۔ واپس بھی مجھے خالی آنا پڑے گا۔ کیونکہ اس وقت دریا عبور کرنے لوگ نہیں آتے''

تم خالی کشتی واپسی لانے کی فکر مت کرو میں تمہیں زیادہ رقم دوں گا۔ تمہیں منہ مانگے پیسے دوں گا۔

''جناب کرائے کی بات نہیں ہے دراصل آجکل میری صحت اچھی نہیں۔ اس لیے پار جا کر واپس آنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں''

نوارد کچھ نہ بولا کنارے کے ساتھ شفاف پانی میں نظر آتی مچھلیوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور چلتا ہوا پانی کے قریب آ گیا۔ اچانک ارد گرد درختوں پر موجود سینکڑوں پرندے شور مچاتے درختوں سے پرواز کر کے جھونپڑی کے اوپر منڈلانے لگے۔ ''خدا خیر کرے۔ پرندے کیوں خوف زدہ ہو کر اڑنا شروع ہو گئے ہیں۔'' اس شخص نے پانی سے نظریں ہٹا کر فضا میں محوِ پرواز پرندوں کو دیکھا اور ہلکا سا مسکرایا جیسے ان کی بے چینی کی وجہ جانتا ہو۔

سورج ڈوبنے کے قریب ہو چکا تھا اور دریا کے پار درختوں کی اوٹ سے تھوڑا سا نظر آ رہا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں میں علی الصبح آپ کو دریا پار چھوڑ آؤنگا۔ آپ یقیناً ہمارے گاؤں میں ہی کسی کے مہمان ہونگے۔ رات ان کے ہاں ہی قیام کریں۔''

''میں اس گاؤں میں کسی کو ذاتی طور پر نہیں جانتا اور نہ ہی میں کسی کا مہمان ہوں۔''

''کوئی بات نہیں، آپ میرے مہمان رہیں۔ میں آپ کے کھانے اور بستر کا بندوبست کر دوں گا۔ میرے لیے یہ بات بہت خوشی کی ہوگی اگر آپ ادھر قیام کریں۔''

''قیام کرنا میرے لیے ممکن نہیں میں بہت ضروری کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں اور میرا ادھر

جانا بہت ضروری ہے۔''

''لیکن اس وقت پار جانا آپ کا ممکن نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے کچھ سوچتا ہوں''

وہ چلتا ہوا واپس چارپائی پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

میں آپ کو چائے بنا کر پیش کرتا ہوں۔آپ کے آنے سے قبل میں اپنے لیے چائے بنانے ہی والا تھا۔

''ہاں یہ اچھا خیال ہے۔میں تمھارے ساتھ چائے پی لوں گا''

وہ چارپائی سے اٹھ کر چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

کچھ دیر بعد بھاپ اڑاتی چائے کے دو پیالے ایک لکڑی کی پرانی ٹرے میں رکھے وہ واپس چارپائی کے پاس آ گیا۔

''تم اکیلے دریا کے کنارے اس جھونپڑی میں رہتے ہو۔کیا تمہاری اولاد نہیں ہے۔''اس کے بات کرنے کے اندز سے تکبّر جھلکتا تھا۔میرے دو بیٹے ہیں اور وہ بھی صاحبِ اولاد ہیں۔بس میں اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر ادھر آ گیا۔مجھے دریا بچپن سے ہی اپنا ہم راز اور دوست لگتا ہے۔اس کا ساتھ اور اس کی ہمسائیگی انسانوں سے کہیں بہتر ہے۔''

''یہ تم نے صحیح کہا۔انسان سے تو ہر مخلوق بہتر ہے''اس نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

فضا میں بے چین اور خوف زدہ ہو کر پرواز کرنے والے پرندے واپس اپنے درختوں پر واپس بیٹھ چکے تھے۔

''کتنی مدت ہوئی تمہیں اس دریا میں کشتی چلاتے ہوئے''

تقریباً چار سال ہو رہے ہیں۔میں اپنے گاؤں کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا۔نجانے کیوں لوگوں سے اور دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا۔ میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ایک سال گاؤں

میں اپنے گھر رہا۔ پھر اپنے بیٹوں اور ان کی بیویوں کے رویے سے دل برداشتہ ہو گیا۔ میری زوجہ دس سال ہوئے انتقال کر گئی تھی۔ بیٹوں کی بے اعتنائی اور غلط رویے سے بہت دکھی ہوا اور اپنے ہاتھوں اور محنت سے بنایا ہوا گھر چھوڑ کر اس جھونپڑی میں آن بسا۔

''تم تو خود استاد ہو۔ پھر کیوں تمھارے بیٹے ایسے نافرمان نکلے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے ان کی تربیت اچھی نہیں کی۔''

میں نے اپنی پوری کوشش کی کہ ان کی تربیت اور تعلیم میں کوئی کمی نہ رہ جائے لیکن میری بدقسمتی وہ اچھے انسان نہ بن پائے۔ شاید یہی خدا کو منظور تھا۔''

''خدا کو کیوں منظور تھا۔ تمھارے بیٹے بگاڑ کر خدا کو کیا فائدہ ہونا تھا۔ یہ اچھی بات ہے تم نے اس میں شیطان کو قصوروار نہیں ٹھہرایا۔ کہ اس ظالم نے تمھارے بچے خراب کر دیئے ہیں۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں وہ تو مردود ہے ہی۔ اسے الزام دے کر کیا حاصل''

''جناب آپ نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ ویسے تو آپ کے لباس گفتگو اور شخصیت سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ تعلیم یافتہ اور باعزت انسان ہیں لیکن مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اپنے متعلق کچھ بتائیں۔''

''میرے متعلق جان کر تم نے کیا کرنا ہے۔ اگر تمھیں میری حقیقت معلوم ہوگئی تو تم گھبرا جاؤ گے۔ میری بات پر یقین نہیں کرو گے اور شدید دہشت زدہ ہو جاؤ گے۔ بس اتنا بتائے دیتا ہوں کہ نہ مجھے بھوک لگتی ہے نہ مجھے پیاس ستاتی ہے۔ نہ میں تھکتا ہوں نہ مجھ پر نیند غلبہ پا سکتی ہے۔ نہ کوئی مجھے ہلاک کر سکتا ہے''

وہ اس کے چہرے پر آئے خوف اور عقیدت کے جذبات کو پڑھ کر بولا۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو بالکل غلط۔ تم سنے سنائے قصوں سے سمجھتے ہو کہ خدا انسانی شکل میں لوگوں سے ملتا ہے اور میں اس شکل میں تمہارے سامنے ہوں۔ غلط سمجھ رہے ہو میں اس کی ضد

ہوں۔ میں رحمان نہیں شیطان ہوں۔''

''مذاق میں بھی اپنے آپ کو شیطان کہنا گناہ کا سبب ہے اور نا مناسب بات ہے۔''

''میں تم سے مذاق نہیں کر رہا میں حقیقت میں ابلیس ہوں۔''

ملاح کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور خوف سے اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔''کیا میں اتنا گناہگار ہوں کہ تم ظاہری شکل میں میرے پاس چلے آئے''

اس نے کافی حد تک اپنے ڈر پر قابو پاتے ہوئے اسے کہا۔

''مجھے تمھارے گناہ و ثواب سے کوئی غرض نہیں۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا نجانے کیوں دل چاہا کہ تم سے رک کر گفتگو کروں ورنہ دریا کو پار کرنے کے لیے مجھے کسی کشتی کی ضرورت نہیں۔''

وہ کچھ نہ بولا۔ اب وہ اسے آپ یا جناب کہنے سے گھبرا رہا تھا کہ کہیں ابلیس کو عزت دینے سے اس کے کئے گئے تمام اعمال ہی اکارت نہ ہو جائیں اور نہ ہی وہ اسے یہ کہہ سکتا تھا کہ میری جھونپڑی میں آ کر آپ نے مہربانی کی میری عزت افزائی کی۔

''تم میری توقع سے کم گھبرائے اور ڈرے ہو۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''ہم بچپن سے تمھارے متعلق سنتے آئے ہیں کہ تم ہر انسان کے ساتھ لگے رہتے ہو اسے خراب اور بدنیت کرنے کے لیے۔ آج اگر میرے سامنے ظاہر ہو گئے ہو تو میں نے سوچا کہ تم فقط مخفی سے ظاہر ہوئے۔ موجود تو پہلے بھی تھے اور نقصان تم ظاہر اور مخفی ایک جتنا ہی کر سکتے ہو تو پھر گھبرانے والی بات کیوں ہو۔''

یہ تم نے عقل مندی کی سوچی۔ انسان کی سوجھ بوجھ کا تو میں ہمیشہ سے قائل ہوں۔ کئی دفعہ سوچتا ہوں میرے حربے اور طریقے ہزاروں سال پرانے ہو چکے ہیں آدمی کی سوچ بامِ عروج پر ہے۔ مجھے اب اپنے داؤ پیچ آزماتے ہوئے خود شرمندگی ہونے لگتی ہے۔ اب مجھے شیطانیت فقط ایک مفروضہ لگتا ہے۔ میں شیطان اور میری شیطانیت ایک انسان اور اس کی انسانیت، تیسرا ہوا حیوان اور اس کی حیوانیت۔ یہ زندگی کی تکون کے تین زاویے اور کنارے ہیں۔ شیطان سے

شیطانیت کی امید کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی حیوان سے حیوانیت''

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور پھر اس کی ران پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولا تم فقط انسان ہی ایسی مخلوق ہو۔ جن سے شیطانیت حیوانیت اور انسانیت تینوں کی توقع ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ اب انسان مجھ سے کہیں بہتر شیطانیت پر قادر ہے۔ اس کی انسانیت میں کتنا دم ہے اس پر میں کوئی بات نہیں کرونگا۔''

''کیا تم انسانوں سے اکثر ملاقات کرتے رہتے ہو۔ جیسے آج میرے پاس آئے ہو۔'' اب وہ نارمل ہو چکا تھا اور اس پر چھائی گھبراہٹ اور خوف دور ہو چکا تھا۔

''کبھی کبھار مل لیتا ہوں کسی ایک آدھ سے۔ مگر بتاتا کسی کو نہیں کہ میں ابلیس ہوں''

''مجھے کیوں بتا دیا۔'' ''کوئی خاص وجہ نہیں دریا کے کنارے اکیلی جھونپڑی میں گم سم لہروں کو دیکھتا عمر رسیدہ شخص مجھے اچھا لگا۔ اس لیے انسانی روپ میں تمہارے پاس چلا آیا۔ ایک راز کی بات تمہیں بتا رہا ہوں۔ جب کبھی بھی میں انسانی روپ دھارتا ہوں تو مجھے اپنے اندر پھرتی اور چستی محسوس ہونے لگتی ہے۔ جبلت اور شیطانی فطرت میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔''

''میں روشنی کا بندوبست کر لوں۔ پھر باتیں کرتے ہیں۔ اندھیرا چھا گیا ہے۔'' وہ اٹھا اور جھونپڑی کے داخلی راستے کے ساتھ لٹکتی لالٹین کو اتارا ہلا کر اس میں تیل کی مقدار کو جانچا اور پھر جیب سے دیا سلائی نکال کر لالٹین روشن کر دی۔ اس نے اسے واپس وہیں لٹکا دیا جہاں سے اتارا تھا۔ لالٹین کی روشنی جھونپڑی اور باہر تقریباً برابر پڑ رہی تھی وہ واپس اس کے پاس آیا۔ چارپائی پر رکھی ایک چادر اٹھائی اور اپنے گرد لپیٹتے ہوئے بولا کہ ''سردی بڑھ گئی ہے یقیناً تمہیں تو گرمی یا سردی سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہوگا لیکن میں ٹھنڈ محسوس کر رہا ہوں۔ بہتر ہوگا میں کچھ آگ روشن کر دوں تاکہ سردی سے بچ سکوں اور روشنی بھی زیادہ ہو جائے گی۔'' ''ٹھیک ہے تم آگ جلا لو'' وہ چلتا ہوا لکڑیوں کے جمع شدہ ڈھیر تک گیا اور وہاں سے چند لکڑیاں لے کر چارپائی سے کچھ فاصلے پر دریا کی سمت انہیں رکھ کر آگ جلا دی۔ اس نے آگ کے اوپر چند لمحوں کے لیے دونوں ہاتھوں کو

تاپا اور پھر ان کو آپس میں رگڑنے کے بعد واپس چارپائی پر بیٹھنے کی بجائے ایک بوسیدہ سے کرسی جھونپڑی سے نکالی اور آگ کے پہلو میں اس کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ آگ کی روشنی چند گز دریا کے اندر تک پھیلی ہوئی تھی اور اس حصہ سے پانی آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بہتا نظر آ رہا تھا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ تم پڑھے لکھے ہو اور ایک سکول میں ہیڈ ماسٹر رہے ہو۔ یقیناً تم نے اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کے متعلق بھی پڑھ رکھا ہوگا؟''

''ہاں! میں اپنے مذہب کے علاوہ چند دوسرے مذاہب کے متعلق بنیادی معلومات رکھتا ہوں اور اپنے دین پر کاربند بھی ہوں، یہ مالک کی مجھ پر خاص مہربانی ہے۔''

ابلیس ہلکا مسکرایا شاید طنزاً۔

''اگر تم اجازت دو تو میں بھی کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں'' ملاح نے اسے کہا۔

''تم ضرور پوچھنا مگر سوالات پوچھنے سے قبل تم مجھے یہ بتاؤ کہ مذہبی طور پر میرے متعلق کیا جانتے ہو اور میرے بارے میں تم کیا رائے رکھتے ہو۔''

ملاح خاموش رہا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ اگر میں اسے کہہ دوں کہ تو میرے نزدیک معتوبِ خدا اور لعین ہے تو کہیں یہ ناراض ہو کر مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

ابلیس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور اس سے گویا ہوا کہ وہ بے دھڑک بول دے جو وہ کہنا چاہتا ہے۔ میں معمولی بات پر طیش میں نہیں آتا۔ صبر کا دامن ہاتھ سے کم چھوڑتا ہوں۔ مغلوب الغضب نہیں ہوں۔ یہ تمام انسانی صفات ہیں اس لیے تم میرے متعلق بھی ایسا ہی گمان کر رہے ہو۔ جو سوچ تمھارے دماغ میں ابھرے گی میں اس کو جان سکتا ہوں۔ تم مجھے ملعون، معتوبِ خدا اور راندہ درگاہ سمجھتے ہو۔ ''اللہ کا باغی'' یہ بھی تمھارے ذہن نے ٹھیک سوچا۔ اس کے علاوہ بھی تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو بول دو۔ مجھ سے مت گھبراؤ اور مذہبی لحاظ سے میری ناراضگی تو تمھارے لیے ذریعہ ثواب ہے۔''

''تم نے میری مشکل آسان کر دی اور میرے خیالات اپنے متعلق بیان کر دیئے، میں ہی نہیں اس کرۂ ارض کے اکثر انسان تمہیں معتوب خدا، سرکش، جہنمی اور لعین مانتے ہیں اور یہ ہمارا عقیدہ ہے ہمیں اللہ کا حکم ہے کہ تمہیں ایسا ہی سمجھیں اور تمھارے رابطے اور تعلق سے اپنے آپ کو بچائیں۔''

اردگرد درختوں پر بیٹھے پرندوں میں سے کبھی کبھی کسی کی آواز سنائی دیتی تھی مگر اب مکمل سناٹا تھا۔ تاریکی چھا جانے سے ہر جانب خاموشی تھی۔

ابلیس کافی دیر خاموش بیٹھا دریا کے اس حصے کو دیکھتا رہا جہاں الاؤ کے سبب روشنی تھی، پھر اپنی توجہ ہٹا کر بولا کہ تمہارے خیال میں اللہ نے تمہیں مجھ سے رابطہ نہ رکھنے اور کوئی تعلق نہ پیدا کرنے سے منع کیا ہے یا مجھ جیسے کسی اور سے بھی روک رکھا ہے۔

''لیکن تمہارے جیسا کوئی اور کیسے ہوسکتا ہے ابلیس جیسا ملعون اور کون ہوسکتا ہے۔ اللہ کے روبرو کون اس سے بغاوت کی جسارت کرسکتا ہے ویسے تو یہ اخلاق کے دائرے میں نہیں آتا کہ اپنے مہمان کو ساتھ بیٹھا کر اسے ملعون اور لعین کہا جائے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمھارے معاملے میں استثناء حاصل ہے۔''

''تمہارے خیال سے میں نے اللہ کے کس حکم کی خلاف ورزی کی اور مجھ سے کون سا ایسا کام سرزد ہوا جسے تم بغاوت پر مبنی سمجھتے ہو اور کیا تم وہ مقام و مرتبہ جانتے ہو جو مجھے اللہ کے ہاں حاصل تھا جب تک میں آسمانوں سے دھتکارا نہیں گیا۔''

''تم نے کیا نہیں کیا۔ تم باغی ہو، اللہ کے آدم کو سجدہ کرنے کے حکم کو اپنے کانوں سے سن کر اسے درخورِ اعتنا نہیں جانا۔ تمام فرشتے سجدہ ریز ہوگئے سوائے تمھارے۔ تم نے تکبر کیا اور اللہ نے تمہیں اپنے دربار سے نکالتے ہوئے تمہیں متکبر گردانا اور تم پر لعنت کی اور فرمایا کہ اس کی لعنت تم پر ہمیشہ رہے گی۔''

اب وہ فکر مند لگ رہا تھا کہ ان سخت الفاظ پر کہیں شیطان بھڑک نہ جائے اور اسے مجروح کر

کے دریا میں نہ پھینک دے۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابلیس کے چہرے پر غصے کا کوئی تاثر نہ ابھرا وہ زیر لب مسکراتا رہا۔ اسے لگا وہ اس کا تمسخر اڑا رہا ہے۔

''یہ تو بہت خوش مزاج اور دھیمی طبیعت رکھتا ہے ہم ویسے ہی اس سے اتنا خوف کھاتے ہیں۔''

اس خیال کے آنے پر اس نے فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور زیر لب اللہ سے معافی طلب کی۔

''جو تم نے ابھی سوچا تھا وہ زیادہ غلط نہیں۔ واقعی میں دھیما مزاج رکھتا ہوں۔ انسانوں پر تو مجھے غصہ آتا ہی نہیں۔ میں ان سے پیار کرتا ہوں ایسے ہی جیسے ایک چرواہا اپنے ریوڑ سے محبت رکھتا ہے۔ کچھ تو مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہیں فرمانبردار اولاد کی طرح۔ مجھے عداوت اور حسد ہے اللہ کے بندوں سے انسانوں سے نہیں۔ تم ہیڈ ماسٹر رہے ہو امید ہے تم یہ سوال نہیں کرو گے کہ انسان اور بندے میں کیا فرق ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو گے۔ میں تم سے یہ سوال نہیں کرونگا۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہیں علم ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں ابلیس اکیلا شیطان نہیں ہے اس جیسے لاکھوں شیطان ہیں۔ مجھے اپنی بارگاہ سے نکالتے ہوئے خالق کائنات نے مجھے متکبر کہا اور ساتھ کہا کہ نکل جا تو کافرین میں سے ایک کافر ہے۔ انکار کرنے والوں میں سے ایک۔ چنانچہ میں اکیلا نہیں۔ باقی لاکھوں کیونکہ نسل انسانی سے ہیں اس لیے نسل سے وابستگی کے سبب تمہیں سوائے میرے کوئی اور نظر نہیں آتا۔''

''وہ کون ہیں جو تم جیسے اور تمھارے ساتھی اور ہم پیشہ ہیں؟''

ابلیس سنجیدگی سے بولا ''تمہارے دونوں بیٹے اور ان کی بیویاں۔ تمھارے لیے تو ان کی مثال ہی کافی ہے۔ کیا ان کے رویے نے بوڑھے باپ کو اپنا ہی گھر چھوڑنے پر مجبور نہیں کر دیا۔ کیا

قرآن کریم میں اللہ ظالم پر لعنت نہیں کرتا ''لعنت اللہ علی الظالمین'' کیا تمہارے بیٹے ظالم نہیں؟ قرآن جھوٹوں پر بھی لعنت کرتا ہے تم انسانوں کو فقط مجھ پر کی گئی لعنت یاد رہ گئی باقی سب کو بھلا دیا میں تو فقط اکساتا ہوں کسی ظلم یا زیادتی کا خود ارتکاب نہیں کرتا مگر میرے انسانی ساتھی اور شیطان دوسروں کو اکساتے بھی ہیں اور خود ظلم اور جبر کا بازار بھی گرم کرتے ہیں۔ چند ماہ پہلے کی بات ہے عید کا دن تھا۔ میں شہر کا جائزہ لے رہا تھا کہ کیا شر پھیلایا جائے میری توجہ ایک گھر پر گئی۔ متوسط درجے کے ایک ادمی کا گھر، وہاں میاں بیوی اور دو چھوٹے بچے تھے۔ بڑے بچے کی عمر تقریباً نو سال ہوگی اور چھوٹا بچہ تقریباً پانچ سال کا۔ بڑے بچے نے پانچ روزے رکھے تھے اور وہ بہت خوش تھا۔ آج پہلی مرتبہ وہ باپ کے ساتھ نماز پڑھنے مسجد میں جا رہا تھا، صبح ہی اس کی ماں نے اسے نہلا کر ہاتھوں اور منہ پر کریم لگائی تھی جس کے سبب اس کا سرخ وسفید چہرہ چمک رہا تھا۔''

''چند دن قبل بچے کی ماں اس کے لیے نئے کپڑے، ایک خوبصورت چپل جس پر طلائی دھاگے سے پھول بوٹے بنے ہوئے تھے اور ساتھ ایک سرخ رنگ کی گھڑی لائی تھی بچہ بے انتہا خوش تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان چیزوں کو عید کے دن پہنے گا مگر اپنے شوق اور خوشی کے سبب وہ بیگ کھول کر دن میں کئی بار ان کو نکال کر ایک میز پر رکھتا اور کافی دیر انہیں دیکھتا رہتا۔ اسے بے چینی سے عید کے دن کا انتظار تھا۔''

''ایک عجیب چیز ہے انسانی معاشرے میں، ابلیس بچے کے قصے کو روک کر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ غلط کو صحیح اور جھوٹ کو سچ بنانے اور سمجھنے کی خوبی۔ میرے نزدیک یہ اس کی بڑی خوبی اور اچھی چیز ہے۔ یہ اپنے ہی جھوٹ پر کچھ مدت بعد سچ کا گمان کرنے لگتا ہے اور پھر اُسی کا یقین کر لیتا ہے۔ جب بھی حکومتی جبر اور ریاست نے جھوٹ اور مغالطے کو پھیلایا لوگ پہلے اسے سچ اور جھوٹ کے درمیان رکھتے ہیں پھر سچ کا گمان کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی سچائی کے قائل ہو جاتے ہیں، بلکہ اس جھوٹے سچ کے وکیل بن جاتے ہیں۔ میرے کام کو آسان کرنے میں انسان کی یہ فطرت بہت کام آتی ہے اور سچ منوں مٹی تلے دفن ہو جاتا ہے''

''گھر سے مسجد عید کی نماز کے لیے جانے سے قبل بچے نے کم از کم دس دفعہ اپنے آپ کو شیشے میں دیکھا ہوگا۔ اپنی کلائی پر باندھی سرخ گھڑی کو بار بار شیشے کے نزدیک کرتا اور پھر نیچے کر لیتا۔ ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیض اور چپل میں وہ بہت جچ رہا تھا۔ ماں باپ نے اسے چار سو روپے عیدی دی۔ جب باپ بیٹا گھر سے نکلنے لگے تو اس کے پانچ سالہ بھائی نے احتجاج کرتے ہوئے آسمان سر پر اٹھالیا کہ وہ بھی عید گاہ جائے گا۔ باپ نے پیار سے سمجھایا کہ اتنے چھوٹے بچے وہاں نہیں جاتے جب بڑے ہو جاؤ گے پھر تمہیں لے جاؤنگا۔ ابھی اس کی ضد برقرار تھی کہ بڑے بھائی نے اپنی جیب سے عیدی والے چار سو نکالے اور اسے دے دیئے اور کہا کہ ہم تھوڑی دیر بعد نماز پڑھ کر واپس آ جائینگے پھر ہم دونوں اور ابوامی پارک میں جھولے لینے جائیں گے اور چڑیا گھر بھی چلیں گے۔ یہ پیسے تم اپنے پاس رکھو ان سے ہم جھولے لینگے اور آئس کریم بھی کھائینگے۔''

''ابا جب میں نماز پڑھونگا تو اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہوگا۔ ہاں بیٹا اللہ دنیا میں ہر چیز کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔''

''جب میں اسے سجدہ کروں گا تو وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگا اور مجھے جنت دے گا۔''

اس نے باپ کی انگلی پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل! اللہ تمہیں سجدہ کرتے دیکھ کر خوش ہوگا۔'' جنت والے تذکرے کو نجانے وہ کیوں گول کر گیا۔''

بچہ بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی سے قمیض کو پیچھے ہٹاتا اور وقت دیکھتا وہ کوشش کرتا کہ ساتھ چلتے لوگ بھی اس کی گھڑی دیکھیں۔

وہ بہت خوش تھا۔ چشم تصور میں اللہ کو لانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب وہ سجدہ کرے گا تو اللہ کتنا خوش ہو رہا ہوگا۔

''نماز میں سینکڑوں لوگ شامل تھے لیکن پہلے سجدے سے سر اٹھانے سے قبل ہی اس کی معصوم روح جسم چھوڑ گئی۔ درجنوں لوگوں کے ساتھ اس کا باپ بھی زندگی کی بازی ہار گیا اس کی سرخ

گھڑی کلائی پر ہی بندھی تھی مگر کلائی مسجد کی چھت پر پڑی تھی''۔ مکمل سناٹا چھا گیا۔شعلوں اور الاؤ میں جلتی لکڑی کے چٹخنے کی دھیمی آواز کے ساتھ دریا کی لہریں سسکیاں بھرتی محسوس ہونے لگیں۔

ملاح نے اپنے آنسو پونچھے اور رندھی ہوئی آواز میں پوچھا کہ اتنے بے گناہ معصوم لوگوں کو کس نے ہلاک کیا۔ ''کس نے ہلاک کیا'' فقط اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اور پھر طنزاً کچھ دیر مسکراتا رہا اور پھر گویا ہوا۔ ''یقیناً ان کا تعلق جنوں کے گروہ سے نہ تھا وہ تمہارے ہی ہم جنس تھے۔ انسان تھے تربیت یافتہ تو میرے ہی تھے لیکن انسانی سپوت تھے میری امیدوں سے آگے نکل گئے ہیں۔ میں تمہیں کچھ دیر پہلے بتا رہا تھا کہ انسان کی سب سے بڑی خوبی اور میری پسندیدہ صلاحیت اس کی جھوٹ اور سچ میں فرق نہ کرنے کی عادت ہے۔ وہ ظلم کرنے کے بعد اس کو جائز سمجھنے لگتا ہے اور کچھ دیر بعد اسے انصاف اور حق تسلیم کر لیتا ہے جھوٹ کو سچ مان کر اس پر ایمان لے آتا ہے لیکن اگر اس کا مفاد وابستہ ہو تب ایسا کرتا ہے۔''

''میں پوری طرح نہیں سمجھ سکا کہ اس بات سے تمہاری کیا مراد ہے''

ابلیس نے اپنا نیچے والا ہونٹ چوستے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''ہیڈ ماسٹر سے اب تم ملاح بن گئے ہو۔ تمہیں تو زندگی کا وسیع تجربہ ہے تمہیں تو اس کو سمجھتے ہوئے دیر نہیں لگنی چاہیے تھی۔''

وہ پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

''تم روز سنتے اور دیکھتے ہو کہ قتل و غارت کا بازار گرم ہے وحشت و بربریت کا راج ہے ہر طرف میرا سکہ چل رہا ہے، سب میری محکومیت میں سانس لے رہے ہیں۔ اس وقت یہ وسیع دنیا میرے لیے امن و سکون کا گہوارہ بنی سلطنت ہے تمہاری عبادت گاہیں میری آسائش گاہوں میں بدل رہی ہیں۔''

وہ خاموش ہو گیا اور پھر ملاح سے مخاطب ہو کر اس سے سوال کیا۔

''تمہیں کتنا یقین ہے کہ تم جنت حاصل کر پاؤ گے''

''میں کوشش کرتا ہوں کے کسی کے ساتھ ظلم نہ کروں کسی کا حق نہ ماروں۔ اللہ کے دین پر بھی کاربند رہتا ہوں۔ اس کے باوجود جنّت کا امیدوار تو ہوں لیکن یقین نہیں، یہ تو اللہ کے رحم و کرم کی بات ہے۔'' ملاح نے ہاتھ میں پکڑی ایک لکڑی سے کمزور پڑتی آگ کو کریدتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، تم راہِ راست پر بھی رہو اور اس کے عوض تمہیں اپنا حق جنت کی شکل میں نہ ملے۔''

پھر اس نے قہقہہ لگایا اور بولا:

''میرے پیروکاروں کی اکثریت کو اپنے جنتی ہونے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا مجھے اپنے جہنمی ہونے کا۔ اور یہ میری تربیت کا نکتۂ عروج ہے، یہ میرا کمالِ فن ہے۔ وہ تو بہشت کے سوداگر ہیں خود تو کیا دوسروں کو بھی بانٹ رہے ہیں اور فریب پر سچ کا غلاف یوں چڑھا دیتے ہیں کہ بے شمار لوگ ان کے کہنے پر جان نچھاور کر رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں میرے راستے پر چلنے والے کبھی جنت کے خواب بھی نہیں دیکھتے تھے وہ اپنے آپ کو باغی اور گمراہ مانتے تھے اور میرے ذہن میں بھی کبھی نہیں آیا تھا کہ ان کو جنت کے فریب میں مبتلا کروں۔ یہ تو تم انسانوں کی فہم و فراستؔ نے راہ نکال لی کہ کیوں خود کو جہنمی سمجھا جائے ظلم بربریت آتش و خون کا کھیل بھی کھیلو اور بہشت کے ملنے کا یقین بھی رکھو۔ یہ انسانی اختراع ہے اب تو میں ذہنی طور پر انسان کو اپنے سے بہت اعلیٰ و ارفع سمجھتا ہوں۔ شیطانی راستے پر۔''

اس نے ایک آنکھ کو دباتے ہوئے شرارت سے کہا۔

''میرے خیال میں لالٹین کا تیل ختم ہونے والا ہے اس لیے اس کا شعلہ کمزور پڑ گیا ہے میں اس میں کچھ تیل ڈال دوں وہ اٹھ کر ادھر گیا ایک شیشے کی بوتل اٹھائی جس میں مٹی کا تیل تھا اور لالٹین کو اتار کر زمین پر رکھا اور اس میں تیل بھرنے کے بعد اس کی لو تیز کر کے لالٹین کو واپس وہیں لٹکا

دیا۔ آگ بھی اپنی روشنی تقریباً کھو چکی تھی لالٹین تیز کرنے سے خوشگوار سی روشنی چھا گئی۔''

''ہم اتنی دیر سے اکٹھے بیٹھے ہیں لیکن میں نے تمہارا نام نہیں پوچھا۔'' ابلیس نے اس سے پوچھا۔

میرا نام قاسم ہے۔ مگر اکثر لوگ مجھے ''بابا'' کہہ کر پکارتے ہیں اور میرا تذکرہ کرتے ہوئے مجھے ''کشتی والا بابا'' کہتے ہیں۔ گاؤں میں جن کو میرا نام قاسم یاد رہ بھی گیا ہے وہ مجھے بھلا چکے ہیں۔ اب تو میرا نام میرے لیے بھی اہمیت کھو چکا ہے۔''

''تم انسان دوسرے انسان کو اہمیت اور عزت اس کے نفع اور نقصان پہنچانے کی صلاحیت کے لحاظ سے دیتے ہو۔ جب یہ صلاحیت نہ رہے، وہ شخص اپنا مرتبہ ومقام کھو دیتا ہے۔ دوسرے لوگ اس سے تعلق اور واسطہ توڑ لیتے ہیں، اسے بیکار سمجھتے ہوئے۔ جیسے شہد کی مکھی صرف اس پھول کے قریب جائے گی جہاں سے رس چوسا جا سکے۔ وہ کبھی سوکھے پھول کے قریب نہیں پھٹکے گی کیونکہ اب اس میں رس نہیں۔ مکھی رس کے پاس جاتی ہے، پھول کے نہیں۔ انسان فطرتاً اس شہد کی مکھی جیسا ہے۔ وہاں جائے گا جہاں سے اسے رس چوسنے کو ملے گا۔''

''میرے ذہن میں شیطان کا تصور ذرا مختلف تھا۔ تم تو اس سے بہت مختلف نکلے۔''

''کیا تصور تھا تمہارے ذہن میں۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں میں کس نام سے پکاروں ''کشتی والا بابا''، صرف ''بابا'' یا ''قاسم''۔

''تم مجھے چاہے جس نام سے پکارو تمہاری مرضی پر منحصر ہے''

''بابا'' تو یقیناً مجھے نہیں کہنا چاہیے کیونکہ میں تم سے کروڑوں سال عمر میں بڑا ہوں میرے خیال میں ''قاسم'' ٹھیک رہے گا۔''

''رات کافی اندھیری ہے میرے خیال میں تم ادھر ہی رہ جاؤ میں بستر اور کھانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔''

''میرے لیے دن رات، موسم یا وقت کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لیے تم میری فکر نہ کرو۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تمہارے گاؤں والوں کو معلوم ہو گیا کہ میں تمہارا مہمان رہا ہوں، تم نے مجھے بستر اور کھانا مہیا کیا، مجھے چائے پلائی، مجھ سے باتیں کرتے رہے تو تمہارا جو حشر کریں گے تمہارے وہم میں بھی نہیں۔ وہ تمہیں میرا خلیفہ اور پیروکار بنا کر زندہ جلا ڈالیں گے۔ اس لیے ''قاسم میاں'' میرا تمہارے ہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔"

ابلیس کی بات سن کر اس نے خوف زدہ ہو کر اردگرد دیکھا کہ کوئی انہیں باتیں کرتا دیکھ تو نہیں رہا۔

''جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے انسان میں مذہب سے ظاہری وابستگی بڑھتی جا رہی ہے جبکہ دلی لگاؤ کم ہو رہا ہے۔ جس کے سبب وہ متشدد ہو رہا ہے، کیونکہ مذہب کے نام پر تشدد بھی ظاہر داری کی ہی قسم ہے۔ تم لوگ مذہب پر عمل نہیں کرتے لیکن اپنے مذہب کے مخالف یا دوسرے مذہب کے ماننے والے کو تباہ کر کے اپنے خالق کو خوش کرنے کی کوشش میں ہوتے ہو۔ دراصل تشدد انسان کا فطری جذبہ ہے اور ہر مذہب اسی جذبے کو لگام ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ انسان تشدد کے رستے پر چلتا رہے اور مذہب انسان کو تشدد و بربریت سے نہ روک سکے۔ ہم نے اور بات شروع کر دی ہے کچھ دیر پہلے تم بتا رہے تھے کہ تمہارے ذہن میں میرا تصور کچھ مختلف تھا کیا تھا وہ تصور مجھے بھی بتاؤ''

''میرے بچپن کا واقعہ ہے، بہت مدت گزر گئی ایک نوجوان نے اپنے باپ اور سگے بھائی کو قتل کر دیا تھا۔ وہ قاتل تقریباً بیس سال کا ہو گا اور اس کا مقتول بھائی بائیس سال کے لگ بھگ اس زمانے میں قتل و غارت گری بہت کم تھی۔ ہمارے گاؤں میں قتل کا وہ پہلا واقعہ تھا۔ وہ لڑکا گاؤں کی ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا لڑکی کے خاندان والوں کے لڑکے کے خاندان سے تعلقات نہ صرف خراب تھے بلکہ ذات برادری کے لحاظ سے بھی دونوں خاندان ان کی شادی کو ناممکن جانتے تھے، اس لڑکے نے چند دفعہ اپنے والد اور بڑے بھائی سے اپنی شادی کی بات کی لیکن دونوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ لڑکا اپنی محبت سے اپنے بھائی اور والد کی ناراضگی دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ وہ حلیے

اور شکل سے وحشی لگنا شروع ہوگیا۔ گاؤں کی عورتیں باتیں کرتی کہ لڑکی نے اس پر ''کالا جادو'' کیا ہے جس کی وجہ سے کوئی شیطانی روح اس میں آ گئی ہے۔ اس لیے اس کا چہرہ اتنا خوفناک ہوگیا ہے۔''

ایک دوپہر جبکہ اس کا بڑا بھائی اور باپ کھیتوں سے واپس گھر آ کر کھانا کھا رہے تھے اس نے کلہاڑی کے وار کر کے دونوں کو قتل کر دیا۔ گاؤں کے لوگوں نے اسے بمعہ کلہاڑی پکڑ لیا۔ پولیس آنے تک لوگوں نے اسے باندھ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھائے رکھا تھا۔ وحشت سے اس کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔ اس کے کپڑے اور ہاتھ اپنے باپ اور بھائی کے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ چہرے پر بھی خون کے نشانات تھے، اکثر لوگ اسے شیطان کہہ کر برا بھلا کہہ رہے تھے۔ آج تک شیطان کا نام آتے ہی اس کی تصویر میرے سامنے آ جاتی ہے۔''

''میرا خیال تھا تمہارے ذہن میں میرا تصور ہوگا جہاں مجھے ایک خم دار لمبی دم اور دو سینگوں کے ساتھ تصاویر میں دیکھایا جاتا ہے ہاتھ میں لمبا نیزہ جس کے تین پھل ہوتے ہیں'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''تمھاری شکل کیسی ہے؟ میرا مطلب ہے اصل شکل''

''قاسم صاحب کئی موجودات اس کائنات میں ایسے ہیں جن کی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ جیسے ہوا کی کوئی ٹھوس شکل نہیں آگ کی کوئی شکل نہیں ایسے ہی میری شکل تمہاری سمجھ میں آنے والی نہیں۔ ہوسکتا ہے تم اسے دیکھ کر ڈر جاؤ اور اگلی دفعہ تمہیں ملوں تو تم خوف کے مارے بے ہوش ہو جاؤ۔ میرے خیال میں تم میرے موجودہ حلیے سے ہی کام چلاؤ'' وہ بے تکلفی سے بولا۔

''میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، اگر تم اجازت دو''

"کیوں نہیں! ضرور سوال پوچھو۔ تم مجھے پسند آئے ہو۔ ویسے تو کسی کو میں پسند کر لوں تو اس کی عاقبت برباد ہو جانا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔ لیکن میں نے تمہیں اس طریقے سے پسند نہیں کیا۔ میں تمہیں گمراہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ ہم پہلے بات کر رہے تھے کہ ہر انسان

کے ساتھ ایک شیطان ہے تم اسے نفس کا نام دو، دنیا پرستی کہو، جبلت و فطرت گردانو یا لالچ ۔ یہ تمام ایک ہی چیز کے الگ الگ نام ہیں ۔ کچھ لوگوں میں یہ شیطان بہت کمزور ہوتا ہے، ایسے انسان جلدی سے میرے قابو نہیں آتے ۔ چکنی مچھلی کی مانند ہاتھ سے نکل بھاگتے ہیں ۔ مجھے کیونکہ شکار اور مطلوبہ آدمیوں کی کبھی کمی نہیں ہوئی اس لیے ایسے مشکل اور ٹیڑھے لوگوں کو میں نظر انداز کر جاتا ہوں ۔ان پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے۔ قاسم! تم بھی ایسے ہی شریف اور بھلے انسان ہو۔ تمہیں گمراہ کر کے مجھے کچھ حاصل نہیں اور اگر تم گمراہ ہو بھی گئے تو اس جنگل میں دریا کنارے میرے کیا کام آؤ گے ۔ میری بات کو محسوس نہ کرنا تم میرے لیے بیکار انسان ہو جس کا کوئی مصرف نہیں ۔"

قاسم نے لمبا اطمینان کا سانس لیا۔

"اب تم اپنا سوال پوچھو۔"

"میرا تم سے سوال ہے کہ جب خالقِ کائنات نے تمہیں ناراض ہو کر آسمانوں سے بھگا دیا اور نارِ جہنم میں ڈالنے اور وہاں ہمیشہ رکھنے کا فیصلہ سنا دیا تو تم نے اس سے مہلت مانگی۔ مہلت اس لیے لی کہ جس آدم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے تم عذابِ خداوندی کے شکار ہوئے اس کی نسل کو گمراہ کرو گے اور خالق پر ثابت کرو گے کہ تم نے اس ناعاقبت اندیش نسل کے جدِ امجد کو سجدہ نہ کر کے کوئی غلطی نہیں کی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے مہلت اسی لیے مانگی کہ ثابت کر سکوں کہ اس خون آشام۔ ظالم اور بد طینت نسل انسانی کو خلق کرنا کوئی اچھا فیصلہ نہ تھا۔"

مگر میرا سوال ابھی مکمل نہیں ہوا۔اس نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم اپنا سوال مکمل کر لو"

کیا تم اپنی کارکردگی سے مطمئن ہو اور جو دعویٰ تم نے کیا تھا کیا تم اس میں کامیاب ہوتے چلے آرہے ہو اور سمجھتے ہو کہ جو تم نے کہا تھا اس کو ثابت کر دکھایا۔

"ابلیس گہری سوچ میں ڈوب گیا اس نے زمین سے ایک چھوٹی چھڑی اٹھائی اور کافی دیر

زمین کریدتا رہا''

''میں اپنے دعویٰ میں ناکام رہا کیوں کہ جب میں نے اعلانِ بغاوت کیا اور کہا کہ میں ان انسانوں کو گمراہ کروں گا، تیری راہ پر چلنے سے روکوں گا تو خالق نے میری بات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔اس نے فقط اتنا کہا تھا جواب میں کہ ''جو میرے بندے ہیں تو ان کو کبھی گمراہ نہیں کر پائے گا۔'' اور وہ بات حرف بہ حرف درست ہے میں نے اربوں انسانوں کو اتنا گمراہ کیا کہ وہ حیوانیت سے بھی گر گئے۔ میں نے جو چاہا انہوں نے ویسے ہی کیا۔ وہ شیطانیت کے سانچے میں پوری طرح ڈھل گئے۔ خالق نے ان پر توجہ ہی نہیں دی اسے معلوم تھا انسانی جبلت کا حال۔ وہ جانتا تھا انسانی فطرت موم کی مانند ہے جسے گناہ اور لذت کی آگ مین پگھلتے دیر نہیں لگے گی۔ اس نے تو شرط رکھی تھی اپنے بندوں کی۔ ہزار ہا سال گزر گئے میں اور میرے کروڑوں شاگرد کوشش میں لگے ہیں لیکن اس کا کوئی بندہ جان مال اولاد، سکون ملک سب سے ہاتھ دھو کر بھی میرے جال میں کبھی نہیں آیا۔ میں شکست کھا چکا ہوں۔ میں تو فقط انسانوں کو باغی بنا رہا ہوں جو فطرتاً باغی ہیں۔''

"ہم انسان کیونکر باغی ہیں، سب تو تیرے جال میں نہیں آتے۔"

قاسم تم ہیڈ ماسٹر رہے ہو۔ میں تمھارے پاس آتا جاتا رہا کروں گا۔ بہت سی باتیں ہوں گی۔ میں تمہیں تاریخِ عالم کے سربستہ راز بتاؤں گا کہ خالق کے بندوں کے ہاتھوں میں کیسے کیسے ذلیل ہو، نامراد رہا اور کیسے انسانوں کو ہتھیار بنا کر خالق کے محبوب بندوں پر دنیا تنگ کی۔ یہ تمام باتیں آئندہ ملاقاتیں میں کریں گے۔ فقط ایک بات کا جواب تم آج ڈھونڈنا، میں نے غلطی کی میں سمجھا کہ خالق آدم کو سجدے کا حکم دے کر میرا امتحان لینا چاہتا ہے۔ میں نے غلط گمان کیا میرا قیاس پراگندا ہوا۔ میں ملعون اور لعین ٹھہرا، مصداق لعنت قرار پایا اور اس کو میں نے تسلیم کیا۔ میں نے مخلوق کو سجدے سے انکار کیا تھا۔ خالق کو کروڑوں سال سجدے کرتا رہا، اس کو سجدے سے کبھی انکاری نہیں ہوا۔ اب نہیں کرتا کیونکہ یہ اس کا حکم ہے کہ میں ملعون ہوں اور سجدہ مجھ پر ممنوع ہے۔ تم انسان تو خالق کو ہی سجدے سے انکاری ہو جاتے ہو۔ تمہاری اکثریت اسے سجدہ نہیں کرتی اس

کی بات نہیں مانتی اس کے احکامات کی نفی کرتی ہے اگر چہ میں ہی راہنمائی کرتا ہوں۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا اب میں چلتا ہوں جلد ملنے آؤں گا۔ وہ پانی کے اوپر خشک زمین کی مانند چل رہا تھا۔ انگارہ نما روشنی اس سے خارج ہونے لگی۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ رکا اور پلٹ کر بولا، جب رات کو سونے لگو تو غور کرنا انسان بڑا باغی ہے یا شیطان۔ اور پھر وہ نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ قاسم سر کو ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بار بار خیال آتا کہ بات تو وہ صحیح کر گیا۔ نہیں، وہ ابلیس تھا، لعین شیطان، میرے دل میں بڑا وسوسہ ڈال گیا۔ اس باغی مردود کا کام تو ہے ہی انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنا۔

بازاری

چند خراب حال سڑکیں طے کرنے کے بعد کار ایک تنگ سی گلی کے آغاز پر ٹھہر گئی۔ سڑک پر جس سے گلی شروع ہو رہی تھی زیادہ کشادہ نہ تھی اور اوپر سے جا بجا مختلف اشیا اور پھل بیچنے والے ٹھیلوں اور چھابڑوں سے بھری تھی۔ ''تمھیں نام یاد ہے نہ اس لکھاری کا''

جی صاحب! خانزادہ بتایا تھا آپ نے۔ باوردی ڈرائیور نے کار سے باہر نکلتے ہوئے صاحب کو جواب دیا۔

ٹھیک ہے جاؤ اُسے بلا کر لاؤ۔ کار میں بیٹھ کر اس سے بات کر لیتے ہیں۔ تھوڑا سا گلی کے اندر چلنے کے بعد ڈرائیور نے ایک دکاندار سے خانزادہ کے گھر کے متعلق پوچھا ''خانزادہ کون'' دکاندار نے پان کی پیک باہر گلی میں اگلتے ہوئے پوچھا۔

''خانزادہ صاحب لکھاری ہیں۔ افسانے وغیرہ لکھتے ہیں'' ڈرائیور نے دکاندار کو جواب دیا۔

''لکھاری ہیں؟ یہاں تو سب مجھ جیسے دکاندار، مزدور اور چند کلرک رہتے ہیں یہاں لکھاری صاحب کہاں سے آ گئے۔ اچھا ٹھہرو تم کہیں اس موچی خانزادے کا تو نہیں پوچھ رہے''

''جی نہیں۔ وہ موچی کہاں سے ہو گئے۔ ان کے افسانے تو کتابوں میں چھپتے ہیں۔''

''ہاں وہی ہے۔ جب بے چارے کی دہاڑی نہیں لگتی تو کاغذ قلم لے کر کچھ لکھتا رہتا ہے۔ اب تم نے اس کو لکھاری ہی بنا ڈالا۔'' دکاندار نے اس کی سفید وردی جس پر سنہری موٹے پیتل کے بٹن چمک رہے تھے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو بھی ہے۔ اگر آپ کو اس کے گھر کا پتہ معلوم ہے تو بتا دیجئے۔''

''ٹھیک ہے جناب آپ اس کو جو بھی بنائیں۔''

''میں تمھیں اس کی جگہ بتا دیتا ہوں۔ وہ جو بڑا سا سرخ اور سفید بورڈ کھمبے پر نظر آ رہا ہے اس کے بالکل سامنے وہ رہتا ہے۔ وہ جگہ اس کی رہائش بھی ہے اور دکان بھی۔'' اس دکاندار نے دکان سے باہر گلی میں آ کر اسے بتایا۔

''بہت شکریہ آپ کا بھائی صاحب''

دکان کھلی تھی اور وہ اسے ایک کونے میں بیٹھا گلی سے ہی نظر آ گیا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں''

اس نے سر اٹھا کر اپنی عینک درست کرتے ہوئے اسے دیکھا اور پھر اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''تشریف رکھیں'' اس نے ایک بوسیدہ سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ جس کے اسپرنگ بیٹھ چکے تھے اور بھورے رنگ کا فوم اکثر جگہوں سے پھٹے اور مدھم رنگت والے کپڑے سے باہر آیا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے بیٹھنے کے بعد اس نے اس سے پوچھا کہ وہ اس کے کس کام آ سکتا ہے۔" دراصل میرے صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

''اچھا! ضرور ملیں۔ لیکن مجھ غریب سے کوئی بڑا آدمی کیوں ملے گا۔ بہر حال مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تشریف لے آئیں جب چاہیں'' اس نے وہ کاغذات اپنے سامنے سے ہٹا کر ایک کتاب کے نیچے رکھے اور قلم اس پستہ قد میز پر رکھ دیا جو اس پرانے گدے کے سامنے دھری تھی جس پر وہ بیٹھا لکھ رہا تھا۔ چھت سے لٹکتے واحد بلب کی روشنی کافی تیز تھی۔ وہ دکاندار صحیح کہہ رہا تھا یہ تو موچی ہے۔ ڈرائیور نے چند جوڑی پرانے جوتے اور جوتے مرمت کرنے والے اوزار ایک طرف پڑے دیکھ کر سوچا۔ اگر آپ محسوس نہ کریں تو میرے ساتھ باہر سڑک تک چلیں۔ وہاں میرے صاحب کار میں بیٹھے ہیں۔ آج گرمی بہت ہے اس لیے وہ ٹھنڈی کار سے باہر نہیں نکلے''۔

''کون ہیں یہ صاحب''

''جی ان کا نام سلیم سیٹھی ہے۔ شہر کے بڑے تاجر ہیں۔''

''اچھا! سیٹھ تو میں نے سنے تھے یہ سیٹھی کیا ہوا''

وہ ہلکا سا مسکرایا۔

" بھائی ڈرائیور میں ایک غریب آدمی ہوں بڑی مشکل سے زندگی سے نباہ کر رہا ہوں۔ میں نے کسی سیٹھ یا سیٹھی سے کیا لینا۔ میں اس گرمی میں کیوں جاؤں اس آدمی سے ملنے جس کو میں جانتا نہیں۔" اس نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"اگر وہ امیر کبیر یہاں آسکتا ہے تو آئے ورنہ میں نے اس سے کیا لینا دینا"

ڈرائیور برا سا منہ بنا کر واپس کار کی جانب چل دیا۔

''صاحب اس نے ادھر آنے سے انکار کر دیا ہے'' ڈرائیور نے شکایتاً کہا

"جناب وہ تو ایک موچی ہے ویسے ہی اس نے اپنے آپ کو لکھاری مشہور کر رکھا ہے۔"

''وہ کیا کر رہا تھا''

''جناب کچھ نہیں ایک بوسیدہ سی دوکان ہے اس کی، اس میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا''

''ٹھیک ہے تم گاڑی لاک کرو اور مجھے اُس تک لے چلو''

اس نے گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

اُس نے خندہ پیشانی سے دونوں کا استقبال کیا جیسے ہی وہ دکان میں داخل ہوا ڈرائیور واپس گاڑی کے پاس چلا گیا۔ اس نے تاجر کو اسی بوسیدہ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس کے بیٹھنے کے بعد اسی گدے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

دکان کا جائزہ لینے کے بعد وہ گویا ہوا، لگتا ہے آپ رہتے بھی اسی جگہ پر ہیں۔ جی ہاں مجھ اکیلے کے لیے کافی ہے۔ یہ غسل خانہ ہے اس نے ایک عقبی دروازے کی طرف اشارہ کیا اور یہ میرا باورچی خانہ، اس نے ایک گیس کے چولہے اور چند برتنوں کی طرف اشارہ کیا اور یہ میرا بیڈ روم ہے اس نے اسی بوسیدہ گدے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا جس پر وہ دوبارہ بیٹھ چکا تھا۔

بے چارہ بہت غریب ہے۔ اس نے دکان کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔ چلو اچھا ہے اس کسمپرسی میں

تو جلدی سودا بازی کرے گا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''مجھے آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ میں آپ کا بڑا مداح ہوں۔ مختلف رسائل میں چھپے آپ کے افسانے میں نے پڑھے ہیں کیا وجدانی سوچ کے مالک ہیں آپ اور منظر نگاری کے تو آپ بادشاہ ہیں''

''میں آپ کا ممنون ہوں۔ ویسے میرے لیے بڑی حیرت کی بات ہے کہ آپ جیسے کاروباری حضرات نے بھی علم و ادب میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ خدا کا شکر ہے اگر ایسی بات ہے۔''

خانزادہ صاحب میں تو ادب کا بڑا قدردان ہوں۔ بس ایک افسوس ضرور ہوتا ہے کہ ادب لکھنے والوں کی اکثریت تنگدستی کی اسیر ہے۔ میری کوشش ہے ایسے بڑے دماغ لوگوں کی بہتری کے لیے میں کچھ کر سکوں تو میری بڑی خوش قسمتی ہوگی۔''

''سیٹھی صاحب ہم لوگوں کو ہمارے حال میں ہی مگن رہنے دیں۔ ہم لوگوں کو تنگدستی اور افلاس کچھ نہیں کہتی۔ اب وہ ہماری ہم مشرب و ہم پیشہ ہے، ہم راز و ہم دم ہے۔

امیر المومنین جناب علی المرتضیٰؓ کا فرمان ہے ''غنی اصل میں وہ ہے جو قناعت پسند ہے''۔ ورنہ تو قارون کا خزانہ بھی دل و دماغ کی بھوک اور حرص ختم نہیں کر سکتا۔''

''آپ ادھر اکیلے رہتے ہیں۔ اس دکان میں آپ کے خاندان والے کدھر ہیں''

''میری بیوی کا پندرہ سال ہوئے انتقال ہو گیا۔ بڑا بیٹا اپنی فیملی کے ساتھ ناروے رہتا ہے اور چھوٹا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کراچی اور میں یہاں لاہور۔''

''آپ کی آدھی دکان تو کتابوں اور رسالوں سے بھری ہوئی ہے'' اس نے کتابوں کی طرف اشارہ کیا جن کے وہاں جا بجا ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

سیٹھ صاحب کتاب سے دلی لگاؤ اور سچا رشتہ اس مطلبی دنیا سے رشتہ کمزور کرنے میں مددگار ہے۔

آپ یقین کریں مجھے اپنی مفلسی اور کم مائیگی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ میرے درجنوں لکھے ہوئے افسانے پڑے ہیں کوئی پبلشر انہیں چھاپنے والا نہیں۔ کیونکہ میرے پاس چھپائی کے اخراجات برداشت کرنے کی سکت نہیں۔ اگرچہ سب ان افسانوں کی گہرائی اور معیار کے قائل ہیں۔''

''سیٹھ صاحب آپ محسوس نہ کیجئے گا بدقسمتی سے ہمارا سارا معاشرہ تاجرانہ سوچ میں رنگ گیا ہے۔ بازاری معیار اور بازاری رویہ، بازاری لوگ''

''خانزادہ صاحب میں آپ کی مدد کرنے ہی آپ کے پاس آیا ہوں۔ جیسے آپ کہہ رہے ہیں آپ کے پاس کئی درجن افسانے ایسے ہیں جو کسی بھی رسالے میں نہیں چھپتے۔ میں ادب کا بڑا قدردان ہوں۔ میرے پاس روپیہ پیسہ فیکٹریاں، گھر بار، موٹر گاڑیاں کسی چیز کی قلت نہیں بس ادبی میدان میں اپنا تعارف چاہتا ہوں۔''

سیٹھ صاحب اس سلسلے میں آپ کی میں کیا مدد کرسکتا ہوں۔'' اس نے الجھن سے پوچھا۔

''آپ اس طرح کریں آدھے افسانے اپنے نام سے چھپوالیں اس افسانوی مجموعہ کی کل قیمت میں ادا کروں گا اور رائیلٹی کے حق دار آپ ہوں گے۔ اس کے بدلے آپ اپنے آدھے افسانے مجھے بیچ دیں وہ میں اپنے نام سے چھپوالوں گا۔ آپ کا بھی بھلا ہو جائے گا اور میں بھی کچھ نام کمالوں گا''

خانزادہ کا چہرہ پتھر اسا گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ شخص ایسی تجویز دے گا۔ اس نے بڑی مشکل سے غصے پر قابو پایا اور بڑے تحمل سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کو شاید معلوم نہ ہو ہومر نامی ایک اندھا شاعر آج سے تین ہزار سال قبل گزرا اور وہ بھیک مانگ کر اور شعر سنا کر زندگی گزار گیا۔ تین ہزار سال سے لوگ اسے یاد رکھے ہوئے ہیں۔ میر و غالب کوئی رئیس نہ تھے۔ ان کے زمانے کے کسی رئیس یا راجے مہاراجے کو آج کوئی نہیں جانتا، سوائے ان کے جن کے غالب و میر سے اچھے مراسم تھے۔ میں غربت میں مر جاؤں گا لیکن میرا تخلیق کیا ادب زندہ رہے گا اور مجھے بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ رکھے گا۔ اگر میں وہ گری حرکت کروں جس کا آپ تقاضا کر رہے

ہیں تو ایک تخلیق کار اور ایک بازاری سیٹھ میں کیا فرق رہ جائے گا۔"اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

"آپ کا کام، اجناس، پیداوار اور خدمات کو خریدنا ہے۔ تخلیق کو خریدا نہیں جا سکتا، وہ کوئی بکاؤ چیز نہیں، ادب نہ جنس ہے نہ پیداوار ہے۔ ادب تخلیق کیا جاتا ہے، وہ بازاری سیٹھوں کی پہنچ سے ماورا ہے۔ اور ایک تخلیق کار اور ایک تاجر میں فرق رہنے دیں۔"اور پھر جو اس نے اگلی بات کی اسے سن کر سیٹھ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

چمگادڑ

آنکھ کھلنے پر اس نے بستر پر لیٹے ہوئے ہی ماحول کا جائزہ لیا کمرے میں بہت ہلکی روشنی تھی بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ زیادہ تاریکی نہ تھی۔ میں کہاں ہوں ایک لمحے کے لیے سوچ آئی ساتھ ہی سمجھ گیا کہ وہ وارسا میں ہے جو پولینڈ کا دارالحکومت ہے۔ شیرٹن ہوٹل کے آرام دہ بستر پر وہ چند لمحے آنکھیں کھولے لیٹا رہا اور پھر کروٹ لے کر ہاتھ بڑھایا اور اپنا موبائل فون اٹھا کر وقت دیکھا۔ صبح کے تین بج رہے تھے۔ تین بجے کیوں آنکھ کھل گئی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی۔ وہ ہمیشہ اچھی نیند سوتا اور جو اس کا صبح اٹھنے کا معمول ہوتا تقریباً اس کے آس پاس ہی وہ اکثر جاگتا۔ وہ کچھ سوچ کر خود ہی بڑبڑایا۔ بے چارے دماغ کا تو کوئی قصور نہیں۔ اُس نے تو صحیح وقت پر بیدار کیا۔ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ کل دوپہر وارسا پہنچا تھا اور پولینڈ سے پاکستان کا وقت چار گھنٹے آگے ہے مطلب ہوا دماغ نے اسے پاکستانی وقت کے مطابق ٹھیک صبح کے سات بجے بیدار کیا تھا۔
وہ پھر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد بستر سے اٹھا اور ایک بڑی شیشے کی کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا۔ باہر اسٹریٹ لائیٹ روشن تھیں جن کی روشنی کمرے میں دھیمی دھیمی پھیل گئی۔ آسمان پر تاریکی تھی اور تارے روشن تھے واپس آ کر پھر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بھر وہ بستر پر رہا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس وقت تقریباً صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے ہلکی روشنی پھیل چکی تھی۔ ہوٹل کے ساتھ سے گزرتی سڑک پر کبھی کبھار کوئی گاڑی گزر جاتی۔ اس نے نائیٹ سوٹ اتار کر جوگنگ سوٹ، ساتھ موٹی جیکٹ کے اندر سبز اور سیاہ اونی مفلر ڈال لیا۔

کھڑکی کے موٹے شیشے پر پانی کے قطرے باہر کے موسم کی یخ بستگی کی خبر دے رہے تھے۔

شام کو چند دوستوں کے ساتھ کافی پینے کے لیے ہوٹل کے مرکزی دروازے کے سامنے موجود سڑک سے پار ایک کافی بار میں گئے تھے تو اس نے جائزہ لیا تھا کہ ہوٹل سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ایک وسیع پارک شروع ہو رہا تھا۔

ہوٹل کی لابی میں چند لوگ اپنے سامان کے ساتھ بیٹھے تھے شاید صبح کی فلائیٹ سے روانہ ہو رہے تھے۔ جب وہ ہوٹل سے باہر نکلا تو سردی نے مفلر کے اوپر جیکیٹ کے بٹن بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد سردی کا احساس زائل ہو گیا۔ پارک میں داخل ہونے کے بعد چوڑے زینے اترنے کے بعد پارک کے نچلے درجے میں آ گیا۔ لاتعداد دیو قامت قدیم سرسبز درخت موجود تھے، ان کے درمیان بل کھاتی پیدل چلنے کے لیے روشیں۔ تقریباً دس منٹ بعد گلابی صبح کا گھونگھٹ ہٹا کر سنہری صبح اپنا نقاب اٹھانے لگی۔ لیکن بہت ہلکے ہلکے۔ اپریل کا تیسرا ہفتہ ختم ہونے والا تھا درختوں کے شگوفے اپنی نوخیزی کی عمر میں تھے سنہری کرنیں شگوفوں کو سنہری مائل سبز رنگ دے رہی تھیں۔ سارا ماحول آنکھوں اور دل و دماغ کو بہت اچھا لگا۔ ایک حوض کے اندر چند خوش رنگ مرغابیاں سر پروں میں دیئے ابھی جاگنے کی تیاری کر رہی تھیں۔

اسے پریشانی ہوئی جب کئی جگہوں پر صحت مند کتوں کے ساتھ ناتواں بوڑھے مرد و زن کو آتے دیکھا۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر یہ کتے اپنے مالکوں سے بے قابو ہونے کی کوشش کریں تو انہیں زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑے گی۔ پارک وسیع و عریض تھا۔ ایک چوری سڑک پارک کو دولخت کر رہی تھی۔ وارسا جاگ چکا تھا۔ کئی گاڑیاں زناٹے بھرتیں اس سڑک سے گزر گئیں۔ سڑک کو اس نے کراس کیا اور سڑک نما چوڑے راستے پر چلتا گیا جس کے دونوں جانب درختوں کے نیچے لکڑی کے بینچ رکھے تھے ان درختوں کی پشت پر کہیں کہیں رہائشی اپارٹمنٹس کے کئی منزلہ بلاک بنے ہوئے تھے۔ جہاں پارک کو ایک اور معروف چوڑی سڑک کراس کر رہی تھی۔ وہاں وہ کچھ لمحے کے لیے رکا۔ اس کے پہلو میں گمنام سپاہی کی یادگار بنی تھی اس پر قد آدم سے بڑا ایک سپاہی کا فولادی مجسمہ بنا تھا جس نے لمبی رائفل لٹکائی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے زمین میں دفن

بارودی سرنگ نکال رہا تھا۔ ساتھ نجانے کیا پولش زبان میں لکھا ہوا تھا۔ کل کے رکھے گئے خوبصورت پھولوں کے متعدد گلدستے اس کے اردگرد سجے تھے۔ اس نے واپسی کا سوچا۔ دور پارک سے بلندی پر اس کے ہوٹل کی عمارت نظر آ رہی تھی اور بڑا سا گول دائرے میں لکھا شیرٹن وہاں سے پڑھا جا سکتا تھا۔ واپسی تک تقریباً چار کلومیٹر واک ہو چکی ہوگی۔ اس نے سوچا۔

گزشتہ شام ان کے وفد کے اراکین کو بتایا گیا تھا کہ سب تیار ہو کر آٹھ بجے تک نیچے لاؤنج میں جمع ہو جائیں کیونکہ انہوں نے کئی سرکاری دفاتر کو وزٹ کرنا تھا اور انہوں نے پہلے ساڑھے آٹھ بجے نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی آف پولینڈ کا دورہ کرنا تھا اور وہاں چند گھنٹے گزارنے تھے بعد دوپہر کا کھانا بھی اُدھر ہی تھا۔ وہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھا اور نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی آف پاکستان میں مزید ترقی کے لیے وہ لازمی کورس کر رہا تھا۔ ہوٹل سے جانے والی آرام دہ بس وارسا گھوماتی ساڑھے آٹھ بجے انہیں نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی وارسا لے آئی متعدد سینئر فوجی افسران نے ان کے وفد کا پرتپاک استقبال کیا اور سیدھا ایک وسیع لیکچر روم میں لے گئے۔ جتنی تعداد میں وہ تھے تقریباً اتنے ہی پولینڈ کے فوجی افسران ہال میں ان کے پیچھے آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں کے چیف انسٹرکٹر نے تعارفی خطاب کیا اور سب کو خوش آمدید کہا اور پھر ایک عمر رسیدہ ریٹائرڈ بریگیڈیئر نے اپنا خطاب شروع کیا۔

بریگیڈیئر صاحب کا لیکچر شروع ہونے سے قبل اس نے اپنے سول کورس میٹ مشہود کو جو اس کے برابر بیٹھا تھا سے کہا کہ یار پھنس گئے ہیں سب سے اگلی نشستوں پر بیٹھ کر غلطی کی ہے۔

مجھے تو لیکچر شروع ہونے سے قبل نیند آنا شروع ہو گئی ہے اور ہمارا چیف انسٹرکٹر پولش چیف انسٹرکٹر کے ساتھ ان کے بالمقابل بیٹھے ہیں مشہود نے اسے کہا کہ نیند تو مجھے بھی بہت آ رہی ہے۔ نیند آ جانا بڑی غلط بات ہے۔ پولینڈ والے کیا کہیں گے کہ یہ آتے ساتھ ہی سونے لگے۔ انہیں کیا معلوم وہ تین بجے کا بیدار ہے۔ سامنے تصاویر دکھانے کے لیے جو پردہ لٹک رہا تھا اس کے اوپر دائیں کنارے پر ایک عقاب بنا ہوا تھا جس نے اپنے پر بالکل اوپر اٹھا رکھے تھے جیسے پرواز

کرنے ہی والا ہے اور پنجے نیچے کو لٹکے ہوئے۔ اس نے اپنے ساتھی کو مخاطب ہو کر کہا یہ پولینڈ والوں کا عقاب مجھے عقاب سے زیادہ چمگادڑ لگ رہا ہے۔ مشہود نے قہقہہ لگایا اور کہا نہیں جناب یہ عقاب ہی ہے۔ اس نے کہا ہم دونوں سوچتے ہیں کہ یہ عقاب ہے یا چمگادڑ اور اسی ذہنی کشمکش سے شاید نیند بھاگ جائے۔

بریگیڈیئر صاحب اپنا لیکچر شروع کر چکے تھے کچھ لمحے وہ لیکچر سنتے ہوئے عقاب کو دیکھ کر سوچتا رہا کہ یہ عقاب ہے یا چمگادڑ تاکہ نیند غالب نہ آ سکے۔ آہستہ آہستہ وہ عقاب چھوٹا ہونا شروع ہو گیا اور بریگیڈیئر صاحب کی آواز بھی مدھم پڑنے لگی۔ اس کا اور اس کے دوستوں کا شور بڑھنے لگا، جو وسیع و عریض پختہ چبوترے پر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ چبوترے کے ایک کنارے سے دوسرے کی طرف دیوانہ وار بھاگتے ہوئے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں جب وہ شہر سے چھٹیاں گزارنے اپنے گاؤں آتا تو مختلف کھیلوں میں اس کا پسندیدہ کھیل اپنے چند ہم عمر دوستوں کے ساتھ اپنے مہمان خانے کے چبوترے پر چھوٹے چمگادڑ کو مار گرانے کی کوشش ہوتا۔ سردیوں کے موسم میں جمع کی ہوئی کپاس کی فصل کی چھڑیاں یا خشک پودے دور دیوار کے ساتھ ایک ڈھیر کی صورت میں جمع رہتے۔ جن کو ایندھن کے لیے استعمال کیا جاتا۔ وہ شام کو ڈھیر سے لمبی چھڑیاں الگ کرتے اور چبوترے پر ادھر ادھر نیچی پرواز کرتے چمگادڑوں کو شکار کی کوشش کرتے۔ اسے اس دلچسپ شغل میں کچھ سدھ بدھ نہ رہ جاتی۔ شاید ہی کبھی کوئی چمگادڑ انہوں نے مار گرایا ہو سوائے ایک آدھ دفعہ کے۔ وہ اس بھاگ دوڑ میں بہت لطف اندوز ہوتا۔ جب تک تھکن سے چور نہ ہو جاتا مسلسل چمگادڑوں کے تعاقب میں بھاگتا رہتا۔ ایک دن بھاگتے بھاگتے ہانپنے لگا اور ساتھ پڑی کرسیوں میں سے ایک پر نیم دراز ہو گیا ہاتھ میں پکڑی چھڑی اس نے پھینک دی۔

اس کے دوست بھی کھیل ختم کر کے بیٹھ چکے تھے۔ چند منٹ وہ لمبے سانس لے کر دوبارہ تروتازہ ہو گئے۔ ''چلو اب سب بچے اپنے گھروں کو جائیں۔ اندھیرا ہونے والا ہے۔ آپ بھی

اٹھیں میں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ ان کے ایک ملازم نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کہا۔ سب اس ملازم کی بات سن کر اٹھ کر اچھلتے کودتے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

وہ کئی سال سے یہی کھیل اس جگہ کھیلتے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جولائی اگست کے مہینے سکول بند ہونے کے سبب شہر سے اپنے گاؤں آجایا کرتا اور اکثر شام کو وہ اسی طرح اس وسیع چبوترے پر دھما چوکڑی مچاتے۔ ان کا ملازم اسے مہمان خانے سے ساتھ لیے ان کے گھر کے دروازے تک آیا، وہ گھر میں چلا گیا تھا۔ اس کے بعد زندگی میں کبھی وہ چمگادڑوں کے پیچھے اس طرح نہ بھاگا۔ شاید اگلے سال وہ عمر کے اس حصے سے نکل گیا تھا۔ جہاں دیوانہ وار چھڑی ہاتھ میں لیے اڑتی چمگادڑوں کے پیچھے بھاگنے سے لطف اندوز ہوا جاتا تھا۔

اس کے ذہن میں اُس وقت نہ آیا ہو کہ اب وہ اُس پر کیف کھیل کو کبھی نہ کھیل پائے گا کیونکہ اب وہ جوان ہو رہا تھا۔ وہ اس کا آخری دن تھا چمگادڑوں کے تعاقب کا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ساتھ بیٹھے مشہود نے اسے کہنی مار کر جگایا تھا، وہ ایک لمحے میں اپنے مہمان خانے کے چبوترے سے واپس وارسا لیکچر روم میں تھا۔ بریگیڈیئر صاحب اپنا لیکچر ختم کر کے ان کے چیف انسٹرکٹر سے ہاتھ ملا رہے تھے ''سر آپ تو سو گئے تھے۔''

معزز مہمانان گرامی تشریف لائیں باہر گرم کافی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ پولینڈ کے ایک کرنل صاحب نے انہیں کافی کے لیے مدعو کیا۔ ہال کے اندر بیٹھے پاکستانی اور پولینڈ کے آفیسر آہستہ آہستہ لیکچر روم سے باہر جانے لگے۔ اس کا ذہن ابھی تک بچپن میں گم تھا۔ لاحاصل بھاگنا چمگادڑوں کو مارنے کی کوشش۔ قہقہے، شور، چیخ و پکار۔ یہ سرکاری عہدہ غیر ملکی دورے یہ سب آؤ بھگت، یہ تمکنت یہ شان، کاش بدلی جا سکتی۔ لڑکپن کے اس ولولے، ترنگ اور احساس سے کافی کے آخری گھونٹ تک گم صم وہ اپنے مہمان خانے کے چبوترے اور وارسا کی ڈیفنس یونیورسٹی کے درمیان معلق رہا۔

دوزخی

آمون دیوتا کے مرکزی معبد کی شان وشوکت بیان کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس کی تعمیر کو عرصہ بیت چکا تھا لیکن اس کی آب وتاب مسلسل بڑھ رہی تھی۔ تخت نشین ہونے والا ہر فرعون اس کی آرائش اور توسیع پر دل کھول کر سونا چاندی خرچ کرتا۔ فرعون رعمیس دوم نے تخت سنبھالنے کے بعد پہلا کام اُس معبد کی توسیع کا کیا۔ اس میں وسیع مہمان خانہ تعمیر کروایا مرکزی ہال کو دوگنا وسیع کیا۔ ہال کے بیچ میں موجود وہ کمرہ جس کو ''پاکیزہ ترین'' کہتے تھے اور جہاں فقط مہا پروہت داخل ہوسکتا تھا یا فرعون بذات خود اور وہ بھی فقط سال میں چند مخصوص ایام میں کیونکہ وہ ''مقدس تر'' کمرہ آمون دیوتا کی رہائش تھی۔ اس کمرے کی بیرونی دیواروں پر سونا لگایا گیا جن میں بیش قیمت جواہرات جڑے گئے۔ کئی دفعہ دیوتا کے احکامات جاری کرنے کی آواز اس ''مقدس ترین'' کمرے کے روشن دان سے باہر سنائی دیتی۔ آمون دیوتا اندر موجود مہا پروہت کو حکم جاری کر رہا ہوتا اور مہا پروہت کی منمناتی گھبرائی آواز بھی دیوتا کے حکم کے بعد سنائی دیتی۔ کمرے سے باہر حاضر فرعون کو اس کے بعد کمرے ''مقدس ترین'' میں طلب کیا جاتا۔ مگر فرعون کی موجودگی میں دیوتا کبھی گفتگو نہ کرتا۔

معبد میں وسیع رہائش گاہ مہا پروہت کے لیے نئی تعمیر کروائی گئی۔ اس کے پہلو میں اور بالمقابل بلند ستونوں پر ایستادہ سنگی چھتوں والے طویل برآمدے تعمیر ہوئے۔ صاف پانی کا وسیع تالاب نئی بنی عمارت کے عین بیچ میں تعمیر کروایا۔ مرکزی گزرگاہ کے سامنے دورویہ آمون دیوتا کو مینڈھوں کے روپ میں ظاہر کرتے ہوئے درجنوں مجسمے مضبوط چبوتروں پر بنوائے۔ دیوتا کے سفری بجرے کو نیا بنوایا اور اس کے مرکزی مستول پر خالص سونے کی پتری چڑھوائی۔ اس کے

موٹے بادبانوں کے اوپر کمخواب اور زربفت استعمال کیا گیا۔ اس پر دیوتاؤں کی اتنی دلکش اور خوش رنگ تصاویر بنی ہوئی تھیں کہ انسان حیرت سے آنکھ جھپکنا بھول جائے۔

مجھے اپنے ملک سے مصر کے عظیم الشان دارالحکومت تیپے آئے تقریباً دو ہفتے ہو چکے تھے۔ سردیوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ شام ڈھلے خنکی میں اضافہ ہو جاتا لیکن دن کو تیز چمکتے سورج میں موسم بہت دلفریب تھا۔ اردگرد دیہاتوں کے رہنے والے کاشت کار گندم اور جو کاشت کرنے سے فارغ ہو چکے تھے۔ اسی سبب سے شہر کے چھوٹے بازاروں میں رونق عروج پر تھی۔ کسان اپنی تھوڑی بہت خریداری کے لیے آتے رہتے۔ ساتھ ہی اپنی مرغیاں اور بطخیں بیچنے شہر لے آتے۔ کچھ اپنی بھیڑ بکریاں بھی ہانک لاتے کیونکہ شہر میں قیمت اچھی ملتی تھی۔ آج کل ویسے بھی عظیم الشان جشن کے دن قریب تھے۔ ہمارے ملک میں پرندوں کو شکار کر کے بازار میں بیچنے کا رواج نہیں تھا۔ لیکن مصر میں ایسا ہوتا۔ آج کل بڑی تعداد میں مرغابیاں اور سرخاب دریائے نیل اور اردگرد واقع تالابوں میں آنا شروع ہو گئے تھے کیونکہ سردیاں آ رہی تھیں۔ شکاری انہیں جھیلوں سے پکڑ کر بازار میں فروخت کے لیے لے آتے اسی طرح خرگوش اور ہرن کا گوشت بھی دستیاب ہوتا۔

میں نے تیپے آ کر کارنک معبد کے سامنے وسیع میدان سے دو گلیاں چھوڑ کر ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ جس میں ایک وسیع کمرہ اور اس کے آگے پتھر سے تعمیر کردہ برآمدہ تھا۔ اس کے دونوں کناروں پر ایک جانب باورچی خانہ اور دوسری طرف غسل خانہ تھا۔ غسل خانے کے ساتھ پانی جمع کرنے کے لیے ایک چھوٹا حوض بنا ہوا تھا۔ جس کو ماشکی شام کے وقت پانی سے بھر جاتا۔ میں اپنے ملک سے ایک نوجوان کو ساتھ لے کر آیا تھا جو میرے ساتھ ہی مقیم تھا۔ وہ میرا غلام تھا کیونکہ میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ میں گھوڑے کے علاوہ غلام خریدنے کی سکت رکھتا۔ یہ میرا پہلا غیر ملکی دورہ تھا۔ اس نوجوان کو میں نے اجرت پر رکھا تھا تاکہ تجارتی سفر میں میرا معاون ہو سکے۔ وہ کنعان کے شہر صور کا رہنے والا تھا اور میرا گاؤں بھی صور سے زیادہ فاصلے پر نہیں

تھا۔ اس بیس سالہ نوجوان سے میری ملاقات صور کے بازار میں ہی ہوئی تھی۔ آئست دیوی کے سالانہ جشن میں چند روز رہ گئے تھے۔ مرکزی معبد کو سجانے کا کام تیزی سے جاری تھا۔ درجنوں مختلف رنگوں کے زربفت، ریشم، کمخواب اور حریر کے لمبے جھنڈا نما کپڑے مرکزی استقبالیہ برآمدوں کی چھتوں سے نیچے کی جانب لٹکائے گئے تھے ایسے ہی پرچم دریائے نیل کے گھاٹ سے لے کر وسیع میدان کے گرداگرد اور مرکزی گزرگاہ پر لہرا رہے تھے۔ معبد کے صحن اور اردگرد کھجور کے درختوں کو جو کافی عرصہ بارش نہ ہونے سے گرد آلود ہو چکے تھے انہیں لمبی سیڑھیاں لگا کر پانی سے دھویا گیا تھا۔ اب وہ گہرے سبز پودے رنگین پرچموں سے کم دل کش نہ لگ رہے تھے۔

میرے مکان کے سامنے گلی میں ایک وسیع خوبصورت مکان تھا اور مکان کے ساتھ بڑا مہمان خانہ جو اسی خاندان کی ملکیت تھا جو اس سامنے والے گھر کے رہائشی تھے۔ وہ ایک مذہبی گھرانہ تھا۔ ویسے تو تپے شہر کا ہر فرد اور گھرانہ مذہبی کہا جا سکتا تھا۔ نجانے کیوں ہمارے ملک کنعان میں لوگ مذہبی تو تھے لیکن زیادہ توجہ اپنی زندگی اور کاروبار پر مرکوز رکھتے بانسبت دیوی دیوتاؤں کے۔ ہمارے ہاں کے پروہت اس بات سے ہمیشہ نالاں رہتے اور ہمہ وقت آسمانی عذاب کی خبر دیتے رہتے۔ کل سورج ڈھلنے کے قریب تھا جب میں بازار سے فارغ ہونے اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد گھر سے نکل کر دریا کے گھاٹ کی جانب جا رہا تھا کہ سامنے والے گھر کے سربراہ سے گلی میں ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی اس وقت فارغ تھا چنانچہ باتیں کرتا میرے ساتھ گھاٹ تک چلا آیا۔ دریا کے کنارے پر کئی دکانیں تھیں جہاں اشیائے خورد ونوش بک رہی تھیں۔ ایک بنچ پر ہم بیٹھ گئے کچھ دیر بعد میرا ہمسایہ اٹھا اور اپنے اور میرے لیے خوش ذائقہ شربت کے گلاس خرید لایا۔

کیا تمھارے ملک میں آئست دیوی کی پوجا کی جاتی ہے اور وہاں کے معبد شان وشوکت والے ہیں۔ ''ہمارے ہاں تو لوگ آئست دیوی سے شناسا ہی نہیں میں نے یہ نام تو تپے آ کر سنا ہے۔''

میرے جواب پر وہ حیرت سے آنکھیں جھپکنا بھول گیا کچھ لمحے کھلے منہ سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر تنبیہہ کرنے کے انداز میں کہا کہ مجھے مزاحاً بھی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ روئے زمین پر ایسا بھی کوئی علاقہ ہو جس میں انسان بستے ہوں جو آئست جیسی عظیم المرتبت اور طاقتور دیوی کی پوجا کے انکاری ہوں اور پھر بھی سانس لے رہے ہوں۔ زندہ ہوں۔ کیا تمھارے علاقوں میں جادوٹونہ نہیں ہوتا۔ کیا وہاں سانپ انسانوں کو نہیں ڈستے۔ بالکل سانپ ہوتے ہیں اور ڈستے بھی ہیں جادوٹونہ ہمارے ملک میں بہت عام ہے۔

لیکن کیسے ممکن ہے کہ کوئی بھی جادو آئست دیوی کے بتائے اور سکھائے ہوئے منتروں کے بنا ہو سکے۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ اگر کسی آدمی کو زہریلا سانپ ڈس لے اور وہ آئست دیوی کے منتروں کے بغیر زندہ رہ سکے۔ یہ دنیا اس پر موجود زندگی اور زندگی کی بیشتر نعمتیں آئست دیوی کی عطا کردہ ہیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں۔

''لیکن ہمارے علاقے کے باشندے اس دیوی سے واقف نہیں اور نہ ہی کنعان میں کوئی مندر اس دیوی کا موجود ہے''

ناممکن ناقابلِ یقین کافی دیر وہ خاموش بیٹھا لہروں کے سنگ ڈولتے آمون دیوتا کے بجرے کو دیکھتا رہا جس پر ترچھے ہوتے سورج کی سنہری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ مستول پر لگا خالص سونا اور جواہرات، زربفت، کمخواب اور کتان کے زرق برق بادبان ان کرنوں میں بقعہ نور لگ رہے تھے۔ وہ گہری اور پرعقیدت نظروں سے دیوتا کے بجرے کو دیکھتا رہا اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا کہ ''تمھارے ہاں دیوتاؤں کے علاوہ کوئی دیوی موجود نہیں۔''

''کیوں نہیں ہم لوگ عشتار دیوی کے پجاری ہیں۔ وہ بھی بہت ذی وقار اور طاقتور دیوی ہے لیکن جادوٹونے میں ہم اس کے نام کو یا اس کے منتر نہیں پھونکتے ہمارے دیوہیکل بحری جہاز جہاں تک جاتے ہیں وہاں کی تمام رعایا ہمارے سب سے بڑے خدا اور دیوتا بعل کے پجاری ہیں وہاں پہاڑی کی چوٹی پر موجود خوبصورت مندر بعل کا ہی ہے۔''

''میرے خیال میں آئست دیوی کو تمھارے ملک میں عشتار کہہ کر پکارتے ہوں گے کیونکہ یہ ممکن نہیں آئست دیوی نظر کرم نہ کرے اور کھجور، انجیر، گندم، جو اور کھیرے کی فصلیں پیدا ہو سکیں۔ یہ سب اسی دیوی کا کرم ہے تمام انسانوں پر۔'' میرے ہمسائے نے کچھ سوچ کر کہا۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اقرار میں سر ہلا دیا۔

دریا کے کنارے اور میدان میں بہت رونق تھی۔ ''شہر میں لوگ اردگرد کے شہروں اور دیہاتوں سے آئے ہوئے ہیں۔ آئست دیوی کے جشن میں حصہ لینے، سارے مصر سے لوگ تپے آتے ہیں۔ میرے گھر اور مہمان خانے میں کم از کم پچاس کے قریب میرے رشتہ دار اور دوست آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جب جشن شروع ہوگا تو تم اس کی رفعت و شان دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔''

میں چپ بیٹھا دیوتا کے عالیشان بجرے کو دریائے نیل کی لہروں پر اٹھکیلیاں کرتے دیکھتا رہا۔

''کیا تمہیں آئست دیوی اور اس عظیم اور بلند تر خاندان کی کوئی معرفت یا پہچان نہیں۔ تم ان کے متعلق بالکل لاعلم ہو۔''

اس نے بڑے پریشان چہرے کے ساتھ سوال کیا۔

''میں آئست اور ان کے خاندان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

وہ تھوڑا سا سرک کر مجھ سے دور ہو گیا۔ جیسے میری جہالت اور کفر اس کی زندگی اور آخرت کو خراب نہ کرے۔

میں نے محسوس کیا وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا ہے۔ شاید آئست اور آمون سے معافی مانگ رہا ہوگا کہ مجھ جیسے دوزخی کے اتنا قریب بیٹھا ہے اور مجھے ایک گلاس شربت بھی پلا چکا ہے۔

میں نے ارادہ کیا کہ اسے بتا دوں کہ مجھے تو اپنی دیوی عشتار اور بلند تر دیوتا ''بعل'' سے بھی زیادہ واقفیت نہیں۔ فقط یہ جانتا ہوں کہ وہ ہمارے دیوی اور دیوتا ہیں ان کے علاوہ بھی کئی اور ہیں جن سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ میں ایک معمولی سا تاجر ہوں میں نے اتنے بڑے دیوتاؤں سے کیا لینا۔

''اگر تم مناسب سمجھو تو میں تمہیں آئست دیوی جو مقدس ماں ہے تمام انسانوں کی، ان کا تھوڑا تعارف کروا دوں؟''

میں دراصل معبد کو اندر سے دیکھنا چاہتا تھا۔ جب سے میں کنعان سے تپے آیا تھا وہ عظیم الشان جگہ نہیں دیکھ پایا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ ایک غیر ملکی اور دوسرے مذہب کے شخص کو اس مقدس معبد میں داخلے کی اجازت نہیں ہوگی لیکن کافی دکانداروں نے بتایا کہ وہاں جانے کی کوئی روک ٹوک نہیں۔ آج ادھر ہی جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا کہ اپنے ہم سائے سے بات چیت ہوگئی تھی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تعارف سننے کے لیے آمادگی ظاہر کردی۔

میرے ہمسائے نے کچھ دیر زیر لب کوئی منتر پڑھا۔ اس کے چہرے پر تیقن اور عقیدت پڑھی جا سکتی تھی۔

''ہمارے بہت سارے دیوتا ہیں یہ ہم مصریوں پر عنایت اور کرم ہے آمون اور را دیوتا کا کہ انہوں نے ہر صنعت اور انسانی ضرورت کے الگ دیوتا پیدا کیے تاکہ انسان کی زندگی بہتر گزر سکے سب کا ذکر اور ان کی عظمت بیان کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے میں آج فقط تمہیں مختصراً دیوی آئست کا بتاؤں گا۔

آئست دیوی بہت بلند اور مقتدر دیوتا آسر کی سگی بہن ہے اور اس کے بیٹے حورس دیوتا کی ماں بھی ہے یعنی آسر دیوتا کی، بہن ہے اور بیوی بھی ہے۔ اسی دیوی اور دیوتا کی وجہ سے ہمارے اکثر فرعون اپنی بہنوں سے شادی کرتے ہیں تاکہ خدائی خون پاک رہے جب آسر دیوتا کو اس کے بھائی نے قتل کر کے اس کی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نیل دریا کے پانیوں میں بہا دیا تو آئست دیوی نے جادو کے زور سے بھائی کی لاش کے ٹکڑے پانی سے نکالے۔ ان کو آپس میں جوڑا اور پھر لاش کو حنوط کیا۔ اس حنوط شدہ لاش پر ایک پرندے کی شکل میں آ کر اس کے اوپر نزدیکی میں پرواز کی اور حاملہ ہوئی جس سے اس کا اور آسر دیوتا کا بیٹا پیدا ہوا جو دیوتا حورس ہے۔ یہ وہی ذی وقار دیوتا ہے جو آخرت میں جب روحوں کا حساب کتاب ہوگا یہ دیوتا ترازو قائم کرے

گا۔ سب روحوں کا وزن کیا جائے گا اور پھر ''نجات'' یا ''دوات'' تقسیم کرے گا دیوی آئست کا عظیم فرزند حورس دیوتا۔

انسان کو لاش حنوط کرنے کا طریقہ بھی آئست ماں نے ہی سکھایا تھا۔ کوئی ماہر لاش حنوط نہیں کرسکتا جب تک وہ آئست کا پجاری اور اعلیٰ عبادت گزار نہ ہو۔ مصر کے تمام جادوگروں کو جادو آئست دیوی نے ہی سکھایا۔

ایک دفعہ دیوی کے ذہن میں آیا کہ اپنے باپ اور سب کے خالق را دیوتا کی ساری طاقت پر قبضہ کرلیا جائے۔ اس کے لیے دیوی نے را کی تھوک سے اور مٹی کو ملا کر ایک چھوٹا سانپ بنایا اور اس پر جادو پھونک کر زندہ کر دیا اور ایسے راستے پر چھپا دیا جہاں سے عظیم الشان را مصر کے میدانوں سے دوسرے دیوتاؤں کے ساتھ گزر کر آسمان پر مشرق سے طلوع ہوکر مغرب کی زمین میں چھپ جاتا تھا۔ جب را اس راستے سے گزرا جہاں دیوی نے سانپ چھپا رکھا تھا۔ سانپ تیزی سے گھاس سے نکلا اور را دیوتا کے پاؤں پر ڈس کر اپنا تیز تر جادو والا زہر را کے جسم میں ڈال دیا۔ را دیوتا کی بھیانک چیخ زمین اور آسمان نے سنی۔ سب دیوتا جو را کے ہمراہ نہیں تھے بھاگتے آئے۔ ان میں دیوی آئست بھی تھی جو خوش ہو رہی تھی۔ وہ دراصل را دیوتا کا پوشیدہ اور ''بڑا نام'' جاننا چاہتی تھی جو فقط را دیوتا کو معلوم تھا۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب تک کسی انسان کی ماں اور اس کا نام معلوم نہ ہو جادو اثر نہیں کرتا'' اس نے آئست کا قصہ سناتے ہوئے رک کر مجھ سے سوال کیا۔

''میں جادو کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو باقی بات کل کریں گے میں آج معبد کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہو۔

اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات آ کر گزر گئے شاید وہ خیال کیے تھا کہ اس کی تبلیغ مجھ پر بہت کارگر ہوگی اور میں فوراً آئست دیوی کی عبادت شروع کردوں گا۔

ہم دونوں بنچ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''کل ملیں گے'' اس نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

میں وہاں سے چلتا ہوا معبد کے سامنے آ گیا اور دو رویہ مینڈھوں کے مجسموں کے درمیان سے گزرتا ہوا مرکزی ہال میں چلا آیا۔ ہال بہت وسیع تھا۔ بلند چھت کا بوجھ لاتعداد ستون اٹھائے ہوئے تھے۔ بھورے رنگ کے گرینائٹ پتھر کے ستون اپنے قطر میں اتنے بڑے تھے کہ اگر تین آدمی اپنے بازوؤں کا حلقہ بنا کر ان کو گرفت میں لیں تو شاید ایسا ہو سکے۔ چھت بھی انتہائی مضبوط اور چوڑے سنگی شہتیروں پر جمی تھی۔ چھت اور ستونوں پر مختلف فرعونوں اور دیوی دیوتاؤں کی رنگین تصاویر بنی تھی۔ غالب رنگ سرخ اور سنہرا تھا پتھر کو تراش کر بھی لاتعداد تصاویر اور بت بنے ہوئے تھے۔ ہال میں زیادہ رش نہ تھا کہیں کہیں مرد و زن عقیدت سے ہاتھ باندھے گھوم رہے تھے۔ چند لوگ اِدھر اُدھر سجدہ ریز بھی تھے۔ میں چونکہ ان خداؤں کا پجاری تو کیا انہیں پہچانتا بھی نہ تھا۔ اس لیے کچھ دیر گھومنے کے بعد ہال کے پہلو میں بنے ایک وسیع دالان میں آ گیا۔ وہاں عین وسط میں شفاف پانی سے بھرا ایک وسیع تالاب تھا۔ اس کے چاروں طرف سے سیڑھیاں پانی کے اندر تک جا رہی تھیں۔ مشرقی جانب مہا پروہت کی رہائش گاہ تھی۔ تالاب کی مغربی جانب پتھر کے چار بنچ رکھے تھے۔ ایک پر میں بیٹھ گیا۔ سورج دیوتا کی منزل قریب تھی۔ بس وہ اپنے آسمانی سفینے سے اترنے ہی والا تھا۔ اس کا سنہری عکس پانی میں جھلملا رہا تھا۔

دو نیم برہنہ نوعمر پجاری سامنے کی رہائش گاہ سے نکلے اور تالاب کے قریب ہاتھ باندھے کھڑے ہو گئے۔ ان کا رخ پروہت کی رہائش گاہ کی طرف تھا۔ اُس وسیع دالان کے دو طرف بلند ستونوں پر برآمدہ نما عمارت بنی ہوئی تھی۔ جن کے نیچے چند پجاری اور زائرین لیٹے سستا رہے تھے۔ مرکزی عمارت جدھر سے گزر کر میں دالان میں آیا تھا، ادھر سے ایک عمر رسیدہ آدمی نکلا اور میری طرف آنے لگا۔ وہ اپنے لباس سے مفلس اور چال سے ناتواں لگ رہا تھا۔ کچھ بڑبڑاتا ہوا میرے ساتھ بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر مہا پروہت کی رہائش گاہ سے اوپر آسمان کو دیکھنے لگا۔ وہ اچانک چونکا اور جوش سے بولا ”وہ دیکھو مکار، فریبی اور جھوٹا آ رہا ہے“ اس نے رہائش گاہ کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا جدھر سے ایک قوی الجثہ

شخص چھ دوسرے خدمت گاروں کے درمیان چلتا تالاب کی طرف آ رہا تھا۔اس نے پیلے رنگ کا لبادہ پہن رکھا تھا اور کئی خوش رنگ جواہرات کی لمبی مالائیں اس کی گردن سے لٹک رہی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر دونوں نوجوان پجاری احتراماً ہاتھ باندھ کر جھک گئے۔ وہ تالاب کے کنارے آ کر ایک لکڑی کی نشست پر بیٹھ گیا۔اس کے ساتھ آئے ایک خادم نے تالاب سے پانی کا برتن بھرا اور اس کے ہاتھ اور منہ دھلوایا اس کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر سورج کی طرف منہ کر کے ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھ گیا جسے دو خادم اس کی رہائش گاہ سے اپنے ساتھ لائے تھے۔اس نے ہاتھ جوڑ کر سر سے بلند کئے اور بلند آواز سے بولا

''اے سورج دیوتا اے آمون اے را تو عظیم ہے۔تو دیوتاؤں کا باپ نوع انسانی اور زمین و آسمان پر موجود تمام مخلوق کا خالق، زمین کو روشن کرنے والا، آسمان کو عبور کرنے والا، ذیشان ظہور اور زبردست قوت والا، اونچی کلغی والا، مضبوط سینگوں والا، جس کے برتر پوشیدہ اور اصل نام کو کوئی نہیں جانتا سوائے آئست دیوی کے۔ کیونکہ اس نے تجھ سے وہ نام اپنے جادو والے سانپ کی زہر کے ذریعے اگلوایا وہ دیوی ملکہ ہے تمام جادوگروں کی۔ تیری ستائش اے ہمارے مالک، تیری حمد اے فرعون کے باپ تیری قربان گاہ مخفی ہے۔تو ہمارے نذرانے بڑھاتا ہے اور اپنے معبد کو عظیم تر تو نے بنایا، اے را، اے خپ را، اے آمون را، میں تیرا ادنیٰ خادم''

''یہ سب بکواس ہے، جھوٹ اور دھوکہ، یہ بک رہا ہے موٹا بیل۔ یہ سانڈ بڑا مکار اور کمینہ ہے۔غور سے اسے دیکھو بالکل اس کی شکل دریائی گھوڑے جیسی ہے''۔اس نے میرا ہاتھ ہلاتے ہوئے میری توجہ اس کی طرف کرائی۔

''کیا تم اسے جانتے ہو''

''بڑی اچھی طرح جانتا ہوں یہ معبد کا مہا پروہت ہے ''آمون حوتپ'' ۔ یہ بہت بددیانت ہے، میں اس جگہ کا بیس سال ملازم رہا ہوں، مجھے علم ہے اس بددیانت پروہت نے کتنا بڑا خزانہ چھپا رکھا ہے۔اس عبادت گاہ کو یہ اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہے۔ درجنوں لونڈیاں اور بیویاں ہیں

اس کی۔ وہ دیکھو جو دولڑ کے اس کے ساتھ کھڑے دف بجار ہے ہیں، وہ بیٹے ہیں اس خوفناک دیو کے۔ مجھے اس ظالم بھینسے نے دوروٹیاں کھالینے پر بہت مارااور پھر نوکری سے نکال دیا۔"

"دوروٹیاں کھانے پر نکال دیا۔ مگر کیوں؟ یہ کیا جرم ہوا۔" میں نے اس سے سوال کیا۔

"وہ روٹیاں را دیوتا کے بت کے سامنے کوئی رکھ گیا تھا۔ مجھے بہت بھوک لگی تھی۔ اپنے ہاتھ نہ روک سکا۔ چار میں سے دوروٹیاں اٹھا کر کھالیں۔ باقی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا تھا حالانکہ وہاں بھیڑ کی بھنی ران رکھی تھی۔ ایک بڑی رکابی میں مرغابی کا گوشت تھا اس سے مصالحوں کی انتہائی اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی۔ کھیرے اور پیاز کٹے ہوئے پڑے تھے۔ ایک چھوٹا مٹکا جو کی شراب کا رکھا تھا۔ میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ سوچ کر کہ وہ "را" دیوتا کھائے گا۔ حالانکہ میں نے کبھی دیوتا کو کھاتے پیتے نہ دیکھا تھا۔ وہ سب نذر نذرانے بڑے پجاری ہی گھر لے جاتے تھے۔ میرا پیٹ دوروٹیوں نے بھر دیا تھا۔ مجھے کیا ضرورت تھی دیوتاؤں کی بے ادبی کرتا۔ اس نا ہنجار بد بخت لومڑ کو معلوم ہو گیا اس نے مجھے بہت مارا۔ اذیت دی اور ساتھ کہا کہ میری "کا" یعنی روح میرے مرنے کے بعد ہمیشہ "دوات" میں بھٹکتی رہے گی۔ کبھی نجات نہیں پائے گی اور "دوات" جو پاتال سے بھی نیچے اندھیری جگہ ہے وہاں کا حاکم اژدھا "انخ نترو" مجھے روز ڈسا کرے گا اور موت کا دیوتا "انوبس" ابھی سے میرے انتظار میں لگ گیا ہے اور "حورس دیوتا" جب ترازو قائم کرے گا۔ اس دن میری روح خسارے میں رہے گی۔ "آسر دیوتا" مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔"

"مجھے سب سے زیادہ دکھ اور پریشانی "آسر" کی عداوت سے ہوئی کیونکہ میں اُس کا خاص پجاری تھا۔ میرا باپ بھی آسر کا پجاری تھا۔ ہمارے گھر میں اکثر شام کو "آسر" اور اس کی بہن اور اس کے بیٹے "حورس" کی ماں آئست دیوی کی پوجا کے بعد نذر دی جاتی تھی۔

تقریباً دو سال میں بہت پریشان رہا حتیٰ کہ یہ شہر، یہ علاقہ، مجھے "دوات" محسوس ہونے لگا۔ ہر لمحہ فکر رہتی کہ "انخ نترو" اژدھا سے کیسے بچ پاؤں گا اور "دوات" سے کیسے نجات ملے گی۔

میرے چند دوست ہمارے مذہب سے تعلق نہ رکھتے تھے ان کے دیوتا اور تھے۔ وہ بنی

اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لوگ بہت عرصے سے تپے اور ارد گرد آباد تھے۔ ایک دن میں اپنے ایک دوست کے ساتھ بنی اسرائیل کے ایک کاہن کے پاس گیا اور ان کا مذہب اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس نے بتایا کہ ان کا دیوتا فقط ان کے قبیلے کا دیوتا ہے کوئی غیر ان کے ساتھ شامل نہیں ہوسکتا۔ اس کاہن نے مجھے چند روز بعد آنے کا کہا۔

میں امید لیے اس کے پاس جا پہنچا۔ اس نے کہا کہ اگر میں پہلوٹھی کا ایک سرخ بیل یا پانچ مینڈھے ''یہواہ'' کی قربان گاہ پر سوختنی قربانی کے لیے پیش کروں تو ''دوات'' سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ کیا اس کے علاوہ بھی نجات کی کوئی صورت ہوسکتی ہے۔ میں نے کاہن سے پوچھا۔

اس کا جواب نفی میں تھا۔

میں نے اُس کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا کہ دو روٹیوں کا اتنا بڑا خمیازہ، کیا یہ دیوتاؤں کا انصاف ہے یا تم مذہبی تاجروں کی بے ایمانی؟ اس نے مجھے برا بھلا کہہ کر اپنے گھر سے نکال دیا۔

اس دن میں نے ''دوات'' کی فکر سے یہ سوچ کر نجات پالی کہ اگر دو روٹیوں کے لیے اتنے دیوتا مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں اور مجھے جہنم میں جھونکنے پر آمادہ ہیں تو میں بھی ان سے کنارہ کشی اختیار کرلوں۔ کم ظرف، کنجوس، ظالم۔

یہ عیاش کچھوا، خبیث آمون حوتپ، دیوتاؤں کو ملنے والے زر و جواہر، بیل گندم، جو، کنیزیں، غلام سب ہڑپ کر جائے تب بھی آمون را، خپ را، آسر، آئست اور انوبس کا نمائندہ رہے اور میں غریب دو روٹیوں کے بدلے جہنم میں۔ لعنت ہو سب پر۔ وہ غصے سے کانپنے لگا یہ مذہب کے تاجر روحوں کا خون پیتے ہیں یہ استحصال کے دیوتا ہیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا میری طرف دیکھے بغیر معبد کی مرکزی عمارت کی جانب چل دیا۔ کچھ دور جانے کے بعد مڑ کر میری جانب دیکھا اور چلایا۔ ''یہ گروہ کبھی انسان کو سکون اور اطمینان سے جینے نہیں دے گا۔''

انسان

عثمانی ترک لشکر دیارِ عجم سے واپس لوٹ رہا تھا۔ دوران یلغار اس دفعہ ترکوں کو کوئی خاص کامیابی نہ ملی تھی۔ شدید برف باری ہوتی رہی۔ شہنشاہ ایران کی بہتر حکمت عملی سے ایرانی فوج کچھ نقصان اٹھائے بنا پہاڑوں میں پسپا ہوگئی تھی۔ چند قصبوں اور دارالحکومت کو لوٹنے کے بعد ترک جب واپس ہوئے تو ایرانی چھاپہ مار دستوں نے ہزاروں ترک ہلاک کر دیے۔ جیسے ہی ترک ایرانی حدود سے نکلے شہنشاہ ایران واپس اپنے دارالحکومت اصفہان لوٹ آیا۔ تقریباً ایک ہفتہ ہونے کو تھا جب سے ترک افواج اپنی حدود میں داخل ہو چکی تھیں۔ اور دو دن سے قونیہ شہر سے کچھ فاصلے پر ایک وسیع اور سرسبز وادی کے ایک چھوٹے سے قصبے ارگلی کے قریب لشکر خیمہ زن تھا۔ کل سے عجیب چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ لشکر کی قیادت سلطان سلیمان عالی شان کر رہا تھا۔

جب یہ لشکر حملے کے لیے ایران کی جانب چلا تھا تو لشکر کی قیادت سلطان نے اپنے داماد اور وزیر اعظم رستم پاشا کے حوالے کی۔ ترکوں کی ریت تھی کہ سالارِ لشکر ہمیشہ سلطان خود ہوتا تھا یا ولی عہد سلطنت۔ وزیر اعظم رستم پاشا نے یہ افواہ اڑا دی کہ لشکر سلطان کی قیادت نہ کرنے سے خوش نہیں۔ مجبوراً سلطان سلیمان کو لشکر کی کمان خود سنبھالنا پڑی۔ ترک اس ظالم رسم کے امین تھے کہ نیا سلطان اپنے بھائی اور بھتیجوں کو قتل کروا دیا کرتا تھا ان کا خیال تھا کہ درجن بھر انسان قتل کروانا بہتر ہے بانسبت ہزار ہا فوجی خانہ جنگیوں کی بھینٹ چڑھ جائیں۔ سلطان سلیمان کی منظور نظر دوسری بیوی ریکسلونا جسے حورم سلطان کے نام سے ترک جانتے تھے کے بطن سے تین شہزادے زندہ تھے اور سلطان کا بڑا بیٹا مصطفیٰ بڑی بیگم کے بطن سے تھا۔ حورم سلطان اور اس کے داماد رستم پاشا کی کوشش تھی کہ شہزادہ مصطفیٰ کا کانٹا نکل جائے۔ وزیر اعظم نے سلطان کو باور کروا دیا کہ ترک لشکر

کے روح رواں ''ینی چری'' شہزادہ مصطفیٰ کے حامی ہو چکے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اب سلطانِ معظم تخت سے دستبردار ہو کر سلطنت ولی عہد شہزادہ مصطفیٰ کے حوالے کر دئیں اور شہزادہ مصطفیٰ خود بھی یہی چاہتا ہے۔

وادی ارگلی میں موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سارا لشکر اطمینان اور آسائش میں تھا وافر سامان رسد کے سبب ہر خیمہ میں جشن کا سماں تھا، سوائے سلطان سلیمان عالیشان کے خیمہ میں۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے سخت بے چین تھا۔ شدید الجھن اور بے یقینی کی حالت۔ وہ کیسے یقین کر لیتا کہ اس کا نور چشم فرماں بردار، قابل اور لائق بیٹا اس کے تخت پر قبضہ کرنے کا کوئی منصوبہ بنا سکتا ہے لیکن اس کے ذہن پر یہ بات چبھ رہی تھی کہ اس نے خود بھی اپنے والد اور سلطان وقت سلطان سلیم کے خلاف بغاوت کی تھی، وہ تو اس کی قسمت اچھی کہ سلیمان کی جان بچ گئی۔ سلطان سلیماں نے ولی عہد اپنے بڑے بیٹے شہزادہ مصطفیٰ کو پیغام بھیجا کہ وہ فوراً اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اوپر لگے الزام کی وضاحت کرے۔ پیغام ملنے پر شہزادہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ ساری رات اس کی سوچتے گزری کہ کیا کرے اگر وہ حاضر نہیں ہوتا تو ارادہ بغاوت کے الزام کو سچ سمجھا جائے گا اور اگر وہ چلا جاتا ہے تو جان بھی جا سکتی ہے۔ پھر وہ مطمئن ہو گیا کہ سلطان آخر اس کا باپ ہے ایک افواہ جس میں کوئی صداقت نہیں، اپنے بیٹے کی زندگی لینے کا سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔ اس نے اپنے سالاروں اور وفاداروں کے روکنے کے باوجود بنا لشکر فقط چند سپاہیوں کے ساتھ اپنے باپ سلطان سلیمان کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔

پاکستان میں واقع وادی کاغان انتہائی سرسبز اور قدرتی حسن میں بے مثال ہے۔ وادی کے آغاز میں شوگران کی بلندیاں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ وہ زمانہ طالبعلمی سے اپنے چند دوستوں کے ساتھ گرمیوں میں اکثر شوگراں آتا تھا۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد ملازمت کی پابندیاں اور وقت کی قلت کے سبب ان جنت نظیر پہاڑوں پر آنا بہت کم ہو گیا۔ اس کا آخری چکر ادھر کا تقریباً آج سے تین سال قبل لگا۔ اس وزٹ اور اس سے پہلے چکر میں تقریباً دس سال کا وقفہ حائل

تھا۔اس نے ماحول کو یکسر بدلا ہوا پایا پہلے فقط ایک ریسٹ ہاؤس اور دو ہوٹل تھے مگر اب درجن بھر وسیع ہوٹل بن چکے تھے۔ بڑی تعداد میں سیاح موجود تھے۔مگر میں نے اسی ریسٹ ہاؤس میں رہنے کو ترجیح دی جہاں ایام جوانی میں ٹھہرا کرتا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں کم ہی لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ سہ پہر کو وسیع لان میں کچھ دیر چہل قدمی کرتا رہا اور پھر ڈھلتی دھوپ میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک ویٹر نے چائے کا پوچھا میں چائے کے لیے تمھیں کہنے ہی والا تھا۔تمھارا شکریہ!

کچھ دیر بعد وہ چائے لے آیا۔سرسبز گھاس میں جا بجا چھوٹے چھوٹے پیلے اور گلابی پھول نظر آرہے تھے اور لان کے اختتام پر ایک چھوٹا سا مکئی کا کھیت جس کے پہلو میں ایک نیم پختہ گھر تھا جس کی چمنی سے کمزور سا دھواں نکل رہا تھا۔ڈھلتی دھوپ میں مکئی کی چھلیوں کے لمبے سنہری بال اور چمکدار ہو گئے تھے۔

جناب !اگر آپ اجازت دیں تو میرے والد صاحب آپ کو ملنا چاہتے ہیں۔وہ اس ریسٹ ہاؤس کے ریٹائرڈ خانساماں ہیں اور آپ کو جانتے ہیں۔اس نے چائے کے برتن میز پر سجاتے ہوئے کہا۔

کیوں نہیں،انہیں بلاؤ اور ان کے لیے ایک کپ چائے بھی لیتے آنا۔

تقریباًستر سالہ نور جان کو اس نے دور سے پہچان لیا اور بڑے تپاک سے اسے ملا۔

صاحب آپ سے کافی مدت بعد ملاقات ہوئی، میرا خیال تھا آپ مجھے نہیں پہچان پائیں گے۔ آپ کی شفقت ہے آپ نے مجھے یاد رکھا۔شفقت کی کیا بات ہے اس میں،نور جان آپ سے تعلق تو بہت پرانا ہے۔ آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا انڈوں کا حلوہ اور دیسی مرغ کا روسٹ واہ کیا زبردست ہوتا تھا۔میرے تو منہ میں پانی آ گیا وہ ذائقہ یاد کر کے۔

مجھے یاد ہے۔ہم چند دوست ایک دفعہ پانچ دیسی مرغ شوگران کے نزدیک ہی واقع ایک چھوٹے سے گاؤں سے خرید کر لائے تھے۔شاید چالیس سال ہو گئے ہونگے اس بات کو۔صاحب آپ

کے تین چار دوست تھے جن کے ساتھ ہی اکثر آپ آتے مجھے ان کے نام یاد نہیں رہے۔ ان کا کیا حال ہے۔ خدا کا شکر ہے سب زندہ سلامت ہیں۔ لیکن اوائل جوانی والی انسیت اور دوستی آہستہ آہستہ دھندلا سی جاتی ہے۔ بے شک کم نہ بھی ہو۔ زندگی کی مصروفیت کا ایک اپنا راستہ ہوتا ہے۔ آپ کا ڈرائیور بتا رہا تھا آپ ماشااللہ بہت بڑے افسر ہیں۔

نور جان! یہ فقط چھوٹی مدت کی بات ہوتی ہے پھر سب برابر، اس نے کپ میں بچی چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

تمھاری صحت ماشا اللہ اچھی ہے۔ اور کیوں نہ ہو اتنا پر فضا پہاڑی علاقہ تازہ آب و ہوا ملاوٹ سے پاک غذا۔ اس نے نور جان کے متعلق تبصرہ کیا۔ ''بس مالک کا بہت کرم ہے۔ بیٹے برسر روزگار ہیں۔ ہم غریبوں کا بڑا مسئلہ روزگار ہے اگر وہ حل ہو جائے تو زندگی بس گذر جاتی ہے وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔

''تمھارے کتنے بیٹے ہیں''

جناب میرے دو بیٹے ہیں۔ چند لمحے چپ رہنے کے بعد بولا۔ نہیں! میرے تین بیٹے ہیں۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر آ کر گذر گیا۔ اچھا لیکن پہلے تم نے دو کہا اب تین کہہ رہے ہو۔ کبھی کوئی باپ بیٹوں کو بھی بھول سکتا ہے کہ کتنے ہیں، وہ مسکرا کر بولا۔ یہ آپ نے صحیح کہا کہ کبھی کوئی باپ کسی بیٹے کو کیسے بھول سکتا ہے۔ صاحب اللہ کے کرم سے میرے دو بیٹے زندہ ہیں اور میرا بڑا بیٹا اٹھارہ سال کی عمر میں انتقال کر گیا تھا، اور پھر وہ سوال کئے بنا ہی اس کی موت کی وجہ بتانے لگا۔ جیسے مدت بعد کسی واقف یا غم گُسار سے ملنے پر اپنے رنج والم بیان کرتے ہیں۔

اُس سال بہت سردی پڑی تھی۔ اتنی شدید برف باری تھی کہ چھوٹے درخت اوپر تک برف میں دب گئے۔ سردیوں کے موسم میں ہم لوگ نیچے گاؤں میں چلے جاتے تھے کیونکہ شوگران کا رابطہ برف باری کے سبب باقی علاقوں سے کٹ کر رہ جاتا تھا۔ گاؤں میں کچھ آبادی رہ جاتی۔ میرے ذمہ چونکہ ریسٹ ہاؤس کی نگہداشت بھی تھی اس لیے مجھے اس گاؤں میں ہی رہنا پڑتا اور

چند دن بعد ریسٹ ہاؤس کا چکر لگا جاتا۔ ہمارے پاس ایک گائے تھی جو اکثر اکیلی جنگل سے گھاس اور جڑی بوٹیاں کھا آتی۔ اس کے دودھ سے ہمارا اچھا گذر بسر ہو جاتا۔ کئی دنوں سے برف باری کی شدت کے سبب وہ اپنے کچے کمرے میں ہی بند تھوڑا سا خشک گھاس کھا کر گذارہ کر رہی تھی۔ کئی دنوں کی برف باری رکی تو میرا بیٹا اسے لے کر جنگل میں چلا گیا۔ میں ریسٹ ہاؤس گیا ہوا تھا۔ شام کو موم بتی کی روشنی میں دیکھا کہ وہ رضائی اوڑھے نڈھال سا لگ رہا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں اس کی ماں نے آگ جلا دی تھی تا کہ سردی کا زور کم ہو جائے۔ مجھے وہ اپنے تینوں بچوں میں سب سے پیارا تھا۔

میرا کلیجہ حلق کو آیا جب میں نے اس کے ماتھے اور گالوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اُس کا جسم بخار سے پھنک رہا تھا۔ اس کو جلدی سے میں نے گرم دودھ میں شہد ملا کر پلایا اس کا سر گود میں لے کر دباتا رہا۔ میری یاداشت میں اُس دن سے قبل اُس کا بیمار ہونا نہ تھا۔ محسوس ہوا جیسے مجھے کسی نے جلتی گرم بھٹی میں بند کر دیا ہو۔ اولاد دنیا میں بہت بڑا امتحان ہے۔ خدا نہ کرے آپ کے ہوتے ہوئے انہیں کوئی تکلیف پہنچے۔ رات ہم نے کانٹوں پر گزاری میرے دونوں چھوٹے بیٹے تھک کر سو گئے تھے۔ ہمارے گاؤں کی آدھی کے قریب آبادی جن کے نیچے بالاکوٹ کے نزدیک بھی گھر تھے وہ سردیوں میں نیچے چلے جاتے تھے۔ گاؤں کا واحد حکیم اتفاقاً کسی سبب سے اس سال ادھر ہی مقیم تھا۔ میں علی الصبح اس کے پاس گیا۔ اس نے صاحب جی بڑی شفقت کی کہ اپنی دوائیوں والی پوٹلی ساتھ لے کر ہمارے گھر چلا آیا۔ بیٹے کا اچھی طرح معائنہ کیا کچھ معجون کھانے کے لیے دی اور اپنے ساتھ آنے کا مجھے بولا۔ راستے میں اس نے بتایا کہ سردی لگ جانے سے اسے نمونیہ ہو گیا ہے اُسے شہر کے ہسپتال لے جانا اشد ضروری ہے چند ادویات اس نے مجھے اپنے گھر سے نکال کر دیں۔

میں نے حکیم صاحب کو بتایا تھا کہ سارے راستے برف سے اٹے ہوئے ہیں کم از کم ہفتہ بھر شہر جانے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ ''اللہ مالک ہے میرے پاس جو دوائی میسر تھی دے دی

ہے تم اور اس کی ماں اللہ سے دعا کرو۔ اتنا تیز بخار اور نمونیہ بہت خطرناک ہے۔ اگلے دو دن اُس کے بخار کی شدت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ تکلیف اور فکر کی گرد آلود آندھی ہر لمحہ میرے دل و دماغ مفلوج کیئے ہوئے تھی۔ مجھے کوئی چیز اچھی نہ لگتی۔ تیسرے دن صبح اس کا بخار اور تیز ہو گیا اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ دو پہر تک اس کا سانس سینے میں اٹکنا شروع ہو گیا۔ میں مسلسل اُس کا ماتھا اور منہ چوم رہا تھا۔ اس کی ماں زمین پر اس کے سر کی طرف بیٹھی مسلسل رو رو کر دعائیں کر رہی تھی۔

صاحب جی اس دن اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی زندگی اللہ کو واپس کر کے اس کی زندگی بچا لیتا۔ شام ابھی کچھ دور تھی جب میرے خوبرو اور جوان بیٹے کی آنکھیں میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھہر گئیں۔ روز قیامت بھی شاید میرے لیے اس دن سے زیادہ مشکل نہ ہو۔

بیس سال گزر گئے اس کو ہم سے بچھڑے، لیکن ایک لمحے کے لیے بھی وہ میرے دل سے نہیں ہٹا۔ میں جب بھی اپنے گاؤں جاتا ہوں تو اپنے پوتوں اور پوتیوں کے لیے کھلونے اور ٹافیاں لے کر جاتا ہوں۔ ان میں چیزیں بانٹتے ہوئے میری نگاہیں ان بچوں کو بھی تلاش کرتی ہیں جو کبھی پیدا نہ ہو سکے اور جن کا باپ کسی کا باپ نہ بن پایا فقط میرا بیٹا ہی ہوتے دنیا چھوڑ گیا۔ چند آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر اس کی داڑھی میں جذب ہو گئے میرا دل غم سے بوجھل ہو گیا۔ نور جان مجھے بڑا دکھ ہوا خدا تمھیں غم برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔ صاحب میں معافی چاہتا ہوں یہ قصہ لے کر بیٹھ گیا۔ آپ میرے پرانے مہربان ہیں آپ کو دیکھ کر جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ شام ہو گئی ہے صاحب باہر سردی ہے آپ کمرے میں تشریف لے چلیں میں ناشتے کے بعد حاضر ہونگا۔

وہ سرکاری کام کے سلسلے میں پندرہ دن کے لیے پولینڈ اور جرمنی گیا ہوا تھا۔ روانگی سے قبل اس نے دو ہفتوں کی چھٹی کی تا کہ پولینڈ اور جرمنی کی سرکاری مصروفیت کے بعد ترکی اور یونان میں چھٹیاں گزار سکے۔ آج اسے استنبول آئے تیسرا دن تھا۔ استنبول اس کا پسندیدہ شہر تھا۔ ترکوں سے

وہ دلی محبت کرتا۔ اس نے رہائش کے لیے ایک فلیٹ کرائے پر لیا جس میں ایک بیڈ روم کے علاوہ کچن اور خوبصورتی سے سجا ہوا ڈرائینگ روم بھی تھا۔ پچاس ڈالر یومیہ کرایہ۔ وہ عمر خیام روڈ پر واقع تھا اور اس جگہ کا فاصلہ استنبول کی مشہور استقلال اسٹریٹ سے پیدل پانچ منٹ سے زیادہ نہ تھا۔ اور ''تقسیم اسکوائر'' بھی دس منٹ میں پیدل چلتے پہنچا جا سکتا تھا۔ محلِ وقوع کے لحاظ سے اس کے خیال میں پچاس ڈالر کرایہ بہت مناسب تھا۔ صبح وہ تیار ہو کر فلیٹ سے باہر آیا۔ عمر خیام روڈ سے ٹیکسی لی اور سلطان احمد اسکوائر پر مسجد سلیمانیہ اور آیا صوفیہ کے درمیان اتر گیا یہاں بہت رش تھا دنیا جہاں کے سیاح کیمرے گردنوں سے لٹکائے گھوم رہے تھے۔ مئی کا پہلا ہفتہ تھا۔ مختلف النوع خوش رنگ پھول یہاں موجود پارک میں رنگوں کی برسات کر رہے تھے۔ احمد اسکوائر استنبول کا قدیم حصہ ہے جو ہمہ وقت لوگوں سے بھرا رہتا ہے۔ مسجد سلیمانیہ کے بالمقابل آیا صوفیہ کی دیو قامت تقریباً سولہ سو سالہ پرانی عمارت کے پیچھے توپ کاپی شاہی محل ہے، جو ترکوں سے پہلے رومی شہنشاہوں کے زیر استعمال تھا اور پھر سینکڑوں سال ترک سلاطین یہاں رہے۔

توپ کاپی محل میں سیاح تھے لیکن زیادہ رش نہ تھا۔ وہ تاریخ میں بہت دلچسپی رکھتا تھا جس ملک میں بھی جاتا ان کے قدیم محلات اور قلعوں کو ضرور دیکھتا اور وہاں بیٹھ کر ان جگہوں سے منسلک گزرے واقعات کو چشم تصور سے دیکھتا رہتا۔ محل کا مرکزی حصہ، سلطانوں کے خاص کمرے، دربار، سفیروں کے لیے مخصوص استقبالیہ ہال وہاں واقع عجائب گھر دیکھنے کے بعد ایسی جگہ چلا آیا جہاں سے نیلگوں باسفورس نظر آ رہا تھا۔

قدیم درختوں کے ایک جھنڈ سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ بنا تھا جس کے ساتھ درختوں کے سائے میں گاہکوں کے لیے کرسیاں میز دھرے تھے ایک طرف ہٹی کرسی پر جا بیٹھا ایک ویٹر نے چھوٹی سی میز اس کے سامنے رکھ دی۔ ''میں کافی پیوں گا تھوڑا سا دودھ ڈالتے لانا'' اس نے ویٹر کو کہا۔ کچھ دیر بعد وہ بھاپ اڑاتی کافی اور ساتھ بل لے آیا اس نے رقم ادا کی اور کافی کا تھوڑا ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

قدیم درختوں کی اونچی شاخوں میں چھپی قمریوں کی سُریلی کوکوکوہ کے ساتھ کئی دوسرے پرندوں کی چہچہاہٹ بھی فضا میں بکھری ہوئی تھی۔ محل کے ساتھ واقع فصیل سے پار سمندر کا نیلا پانی کشتیوں کے گل رنگ بادباں کئی بڑے بحری جہاز اور ہر طرف نیلی لہروں میں نہاتی اور تیرتی سنہری کرنیں۔ اس نے کپ سے اٹھتی بھاپ کو نظر بھر کر دیکھا ہاتھ لگا کر کپ میں موجود کافی کا درجہ حرارت جانچا اور پھر درختوں کے جھنڈ کے درمیان سے باسفورس کے پانیوں کو دیکھنے لگا۔ سلطنت عثمانیہ کا دسواں اور نامور ترین سلطان سلیمان عالیشان بھی یہاں رہا۔

ایک دم اس کا خیال باسفورس کے پانیوں بھاپ اڑاتی کافی سے ہٹ کر توپ کاپی محل سے قونیہ کے نزدیک واقع وادی ارگلی کے سلطانی لشکر گاہ میں پہنچ گیا تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل۔ شہزادہ مصطفیٰ اپنے خوبصورت اور جسیم سفید گھوڑے سے بڑے اعتماد کے ساتھ اترا اس کی پگڑی پر لگے جواہرات دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اسے کچھ خوف ضرور تھا کہ اس کا والد شاید اسے معمولی ڈانٹے گا اور پھر اسے گلے لگا لے گا۔ خیمہ سلطانی کے سامنے فوجی دستے ہتھیار بند مستعد کھڑے تھے۔ خیمہ میں داخل ہونے سے قبل اس نے اپنی تلوار اور خنجر پہرہ داروں کے حوالے کیا۔ اور بے دھڑک شاہی خیمہ میں داخل ہو گیا۔ خیمہ خالی تھا تین تنومند غلام ہاتھ پیچھے باندھے خیمے کے اندر موجود تھے۔ باریک ریشمی پردے کے پیچھے منسلک خیمے میں اسے سلطان سلیمان کا ہیولا نظر آیا۔ وہ پردے سے پار باپ کے چہرے کو نہ پڑھ سکا کہ وہ اس کے باپ کا چہرہ نہیں فقط ایک مالک سلطنت کا ہے۔ جنہیں سب سے عزیز سلطنت ہوتی ہے وہ اپنی ہی ذات کا اسیر تھا، جسے اپنے مقابلے میں کسی کی جان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یک بار تینوں قدآور اور توانا غلاموں نے اسے دبوچ لیا اور ایک ریشمی ڈوری اس کے گلے کے گرد کس دی۔ ایک لمحے کے لیے وہ حیرت کے سمندر میں ڈوبا اور پھر اپنی زندگی بچانے کے لیے مچلا۔ ''بابا میں بے قصور ہوں'' وہ ریشمی پردے کے پار کھڑے سلطان سلیمان عالیشاں کو پکارا۔

اس کے طاقتور بازوؤں کی مچھلیاں اور کمر کے پٹھوں نے یک جان ہو کر زندگی کی جستجو کے

لیے زور لگایا اور تینوں غلاموں کو پیچ دیا۔ سلطان کو اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے کوشش اچھی نہ لگی۔ اُس نے پردے سے سر نکال کر جلادوں کو قہر بار نظروں سے گھورا۔ انہوں نے دوبارہ شہزادہ مصطفیٰ کو دبوچ لیا۔ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد اس کے بازو کی مچھلیاں ساکت ہوگئیں اور اس کی روشن خوبصورت آنکھیں ریشمی پردے کے پار دیکھتی ہوئی پتھرا گئیں۔ جوانی کی رعنائی کی جگہ اس کے وجیہ اور خوبصورت چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔

اس کی لاش خیمے کے باہر پھینک دی گئی۔ سلطان گھوڑے پر سوار ہوا اور فوج کو لاش کے قریب سے مارچ کرنے کا حکم ہوا تا کہ سلطان کی ہیبت اور گہری ہو سکے۔

اس کے تصور میں نور جان کی آنکھ میں آئے آنسو گھوم گئے جس میں اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی مرحوم بیٹے کی تصویر دیکھی جا سکتی تھی۔
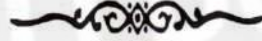
غبارے

''آج میرا دل بہت بے قرار اور اداس ہے''۔

''یہ کوئی نئی بات تو نہیں تم سے جب بھی پوچھا جائے تم اپنی اداسی کا رونا روتے ہو''

''تم بھی اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہے ہو''

''یہ اداسی میری مستقل مہمان ہے۔ میرے پاس آ کر واپسی کا راستہ بھول گئی ہے۔ میرے جسم میں ہی رہتی ہے کبھی کبھی کچھ دیر کے لیے سو جاتی ہے تو مجھے اپنے اردگرد دیکھنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ سمجھ بوجھ کام کرنا شروع کر دیتی ہے اور جب وہ دوبارہ بیدار ہوتی ہے تو عقل و ہوش پر غنودگی چھانے لگتی ہے۔''

میں نے بہت دفعہ تمہیں کہا کہ میرے مدتوں کے دوست ہو اپنی اداسی کا سبب بتاؤ۔ کہتے ہیں کہ غم بانٹنے سے کم ہو جاتا ہے۔ شاید اس طرح تمھارے اس دکھ کا مداوا ہو سکے جو تمھیں ہر وقت مغموم کیئے رکھتا ہے۔''

''میں نے بھی کئی دفعہ سوچا کہ تمہیں اپنے دل کا درد بتاؤں اور زخم جگر دکھاؤں شاید میرے دل و دماغ کو کچھ سکون مل سکے۔ یا کوئی ایسا انسان تمھاری شکل میں ڈھونڈ لوں جس کے ساتھ بیٹھا گھنٹوں باتیں کر سکوں، جو میری روح میں دفن ہیں اور اس سے اب ایک لہلہاتی فصل دکھوں کی جوان ہو چکی ہے''

وہ خاموش ہو گیا۔ دونوں کافی دیر خاموش بیٹھے رہے کبھی کبھی کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔

''آج کچھ سردی ہے۔''

''ہاں، سردی کا موسم جو ہوا۔''

آ ؤ سامنے اس چائے کے اسٹال سے چائے پیتے ہیں اور ساتھ تمھیں اپنی اداسی کا راز بھی بتاتا ہوں۔''

وہ دونوں سڑک کے ساتھ مارکیٹ کے درختوں کے نیچے بنے ایک سرخ رنگ کے چائے اسٹال پر چلے آئے۔ چند کرسیاں دھوپ میں رکھی تھیں دونوں ان پر بیٹھ گئے۔ ان کے کہنے پر اسٹال والوں نے دو کپ بھاپ اڑاتی چائے کے ان کے سامنے رکھ دیئے۔

دونوں خاموش بیٹھے اپنے سامنے رکھے پیالوں میں گرم چائے سے اٹھتی بھاپ کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد چائے کی سطح پر ایک پپڑی سی نمودار ہوکر اس میں سلوٹیں سی بن کر حرکت کرنے لگیں۔

''چائے پئیں ٹھنڈی ہو رہی ہے'' ایک نے دوسرے کی توجہ چائے کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا۔

چند گھونٹ چائے پینے کے بعد وہ بولا۔ جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا مجھے اپنی ایک کلاس فیلو سے محبت ہوگئی۔ ہماری کلاس میں کافی ساری لڑکیاں تھیں لیکن اس کا جواب ہی نہیں تھا۔ ہر طرح کے تصنع اور بناوٹ سے پاک۔ انتہائی خوش شکل اس کی بڑی بڑی آنکھیں ہر وقت مسکراتی محسوس ہوتیں۔ اکثر پھولوں کے پرنٹ والے کپڑے پہنتی۔ تم یقین کرو جب وہ کھل کھلا کر ہنستی تو لگتا جیسے اس کے لباس پر بنے پھول بھی ہنس رہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی شروع ہوئے تقریباً دو ہفتے ہوئے تھے جب میری اس سے پہلی گفتگو ہوئی۔''

عجب گفتگو ہوئی۔ ہم دونوں کینٹین کی طرف جا رہے تھے وہ مجھ سے چند قدم آگے اپنے خیالوں میں مگن آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی، جیسے صحرا میں کوئی ہرنی اکیلی بے فکری سے جانے پہچانے علاقے میں پھر رہی ہو۔ میں تیز قدم اٹھاتا اسکے برابر آیا اور اسے سلام کیا۔

''ہیلو، کیا حال ہے آپ کا'' وہ جواباً بولی

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔''

''میں بھی ٹھیک ہوں''

''آپ کا تعلق کس علاقے سے ہے''

''میرا تعلق مریخ سے ہے'' اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

میں اس کے ردِعمل پر نروس ہو گیا۔

اس نے ہنسی روک کر اپنی ہمہ وقت مسکراتی آنکھیں مجھ پر مرکوز کیں اور کہا کہ میرا سوال پوچھنے سے اسے لگا جیسے میں اسے زمین کی بجائے کسی اور سیارے کی مخلوق سمجھ کر سوال کر رہا ہوں۔

پھر ہم باتیں کرتے کینٹین میں آ گئے۔ اکٹھے بیٹھ کر چائے پی اور کلاس روم میں لوٹ آئے۔ پھر نجانے مجھے کیا ہو گیا۔''

چائے ختم ہو چکی تھی۔ اس کے دوست نے اسٹال پر جا کر پیسے ادا کئے اور واپس اس کے پاس لوٹ آیا۔ میرے خیال میں پھولوں کی نمائش دیکھنے جاتے ہیں۔ یہاں سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر سڑک سے پار جو بڑا پارک ہے اس میں آج کافی رونق ہو گی۔ پھولوں کی ہم سائیگی میں تمھاری محبت کہانی سننے میں زیادہ لطف آئے گا بجائے یہاں سڑک کنارے گاڑیوں کے شور کے درمیان۔

دونوں آہستہ آہستہ وہ ڈھلوان اترنے لگے جس کے اختتام پر شاہراہ تھی اور اس کے پار پارک کو سڑک جاتی تھی۔ اس سڑک کے دونوں جانب دور تک گھنے درخت تھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سڑک کسی جنگل سے گزرتی ہو۔ بڑا خوشگوار موسم تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں کاٹ نہ تھی۔

''ایسی ہوا میری اداسی میں اور اضافہ کر دیتی ہے۔'' انہوں نے پارک کی جانب کچھ فاصلہ طے کر لیا تھا۔

''اب ہم شور شرابے سے کچھ دور آ گئے ہیں تم اپنی بات کو دوبارہ شروع کرو''

''ہاں بات میں شروع کرتا ہوں مگر پہلے تم مجھے بتاؤ کہ تمھیں کبھی کسی سے محبت ہوئی ہے۔''

''مجھے، ہاں کئی دفعہ ہوئی ہے مگر کچھ خاص نہیں۔ یعنی تم جیسی نہیں جو روح کو توڑ مروڑ کر رکھ دے۔''

وہ ہلکا مسکرا کر بولا۔

''اس کا مطلب ہے تمھیں کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی کیونکہ وہ تو ہوتی ہی خاص بلکہ انتہائی خاص۔ تم کہہ رہے ہو کبھی خاص نہیں ہوئی۔ میرے دوست محبت یا پیار کبھی عام ہو ہی نہیں سکتا۔ جو روح کو توڑ نہ دے وہ کیا محبت ہوئی۔ وہ تو فقط دل لگی ہوئی فقط معمولی دوستی۔''

''ہاں شاید ایسا ہی ہو۔''

''اس کا مطلب ہے جناب کو محبت کبھی نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں میری کیفیت تمھاری سمجھ میں آنے والی نہیں۔ لیکن تمہیں بتانے سے میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا اور آئندہ مجھے اداس دیکھ کر تم سوال نہیں کرو گے اور میری اداسی کو زائل کرنے میں بہتر کردار ادا کر سکو گے۔''

''وہ میرے اور دنیا کے درمیان آ گئی۔ مجھے دنیا نظر آنا بند ہو گئی۔ فقط وہ ہی دیکھائی دیتی ہر طرف۔ میری روح پر اس کا مکمل احاطہ تھا۔ جیسے سردیوں میں چمکدار دھوپ اور گرمیوں میں گہرے بادل کا سایہ ہوتا ہے۔ میں ہر شے سے لاتعلق ہو گیا۔ فقط اس کی ذات اس کی سوچ اس کے خیال اس کے تصور میں گم۔ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ بہت زیادہ۔''

کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو گیا۔ نگاہ اٹھا کر تناور درختوں کو دیکھنے لگا۔ چند فرلانگ دور سڑک کی دونوں جانب گاڑیاں پارک تھیں یہ کاریں پھولوں کی نمائش دیکھنے آئے لوگوں کی ہوں گی''

اس نے درختوں سے نگاہ ہٹا کر دور کھڑی گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے کہا

''ہاں ایسی ہی بات ہے''

''مجھے اس کے علاوہ کچھ اچھا نہ لگتا۔ کوئی خیال و سوچ اس کے خیال و سوچ کے علاوہ ذہن

میں نہ سماتا'' وہ ساتھ ہوتی تو دنیا خوبصورت ترین لگتی۔ وہ میرے لیے نشاط کا بادل، کیف کی گھٹا۔ انبساط کی گھن گرج اور آرزوں کی قوس وقزح تھی۔ وہ سب سے مجھے بیگانہ کر کے اپنے ساتھ لے کر چل پڑی تھی۔ مجھے کسی سے کوئی غرض نہ رہی تھی۔ کوئی رشتہ کوئی ناطہ اچھا نہ لگتا۔ میرے دوست اور کلاس فیلو میرا مذاق اڑاتے۔ اور اکثر طعنہ دیتے کہ ایسا عاشق تو کوئی نہیں دیکھا جو فقط اپنی محبوبہ کے علاوہ سب کچھ بھول جائے۔ وہ بھی صحیح کہتے تھے۔ لیکن میں بے بس تھا اس تنکے کی مانند جسے ایک بگولہ اپنے اندر چکر دیتا ساتھ لیے گھوم رہا ہوتا ہے۔ کیا وہ تنکا اس بگولے کی گرفت سے آزاد ہو سکتا ہے جبکہ وہ اس گرفت سے آزادی چاہتا بھی نہ ہو۔ مجھے تو اپنی اس وارفتگی سے بھی پیار تھا۔''

وہ دونوں گاڑیوں کے نزدیک پہنچ گئے۔

''لگتا ہے ہم پارک کے مرکزی گیٹ کے نزدیک آ گئے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک ہے، ہم تقریباً پہنچ گئے ہیں۔''

پارک میں بہت رونق تھی۔ پھولوں کے علاوہ کھانے پینے کی اشیاء کے کئی اسٹال تھے بچوں کے کھلونے اور دستکاری اور پینٹنگز کی نمائش۔ بہت وسیع پارک تھا۔ دسمبر کا پہلا ہفتہ ختم ہونے والا تھا۔ اس شہر میں جتنی سردی ان دنوں پڑتی تھی وہ ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ کئی دن کے ابر آلود موسم اور کل کی مسلسل بوندا باندی کے بعد آج مکمل دھوپ تھی۔ دو دن سے یہاں گلِ داودی کی نمائش منعقد تھی۔ سینکڑوں کی تعداد میں رنگ رنگ کے خوش نما پھولوں کے گملے ایک ترتیب اور مہارت سے ایسے سجائے گئے تھے کہ پھولوں کی خوش رنگی میں اور نکھار آ گیا تھا۔ گھاس اگرچہ ابھی سبز تھا مگر جوانی والی دلکشی اور جاذبیت کھو چکا تھا۔ پارک کے اندر اور کناروں پر تناور درخت تھے۔ چنار کے بلند درخت سرخی مائل ہو چکے تھے پاپولر اور پیپل کے چند درخت پیلا پیرھن پہن چکے تھے۔ چیڑ سر سبز تھے اور کئی اور قسموں کے اشجار خزاں کے سامنے سینہ سپر تھے۔

''واپس کرو میرے غبارے یہ پھٹ جائینگے۔ خدا کے لیے مجھے واپس دے دو'' دو بچے

آگے پیچھے بھاگتے ان کے پاس سے گزر گئے۔

دونوں بچے گل داودی کے گملوں کے درمیان لوگوں کے ہجوم میں بھاگے پھر رہے تھے اور تعاقب کرنے والا بچہ مسلسل غبارے واپس مانگ رہا تھا۔ وہ بچہ اپنے لباس سے کسی کھاتے پیتے گھرانے کا نہیں لگتا تھا۔ اگرچہ اس نے بھی جینز جوگرز اور نیلے رنگ کی جرسی پہن رکھی تھی لیکن لگتا تھا اس کا بڑا بھائی بھی کئی سال ان کو پہن چکا ہے۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے گل داؤدی کو دیکھنے لگے کتنے خوبصورت پھول ہیں۔

''ہاں بہت خوبصورت، کتنے نکھرے ہوئے ہیں ان کے رنگ۔ میرے خیال میں وہ بچہ جس کے ہاتھ میں غبارے ہیں، پیچھے بھاگنے والے بچے کے چھین کر بھاگ رہا ہے''

میرا بھی یہی خیال ہے۔

''یہ عمر بھی کیا زبردست ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں خوشیاں چھپی مل جاتی ہیں۔ غبارے چھین کر بھاگنے والا بچہ کتنا لطف اندوز اور خوش ہو رہا ہوگا۔''

لیکن دوسری طرف دیکھو دو عام سے غبارے چھن جانے پر دوسرا کتنا پریشان اور مضطرب بھاگتا پھر رہا ہے۔''

وہ اچانک اداس ہو گیا۔ غم واندوہ اس کے چہرے سے ٹپکنے لگا۔ وہ دونوں بچے کہاں غائب ہو گئے۔ وہ غم زدہ لہجے میں بولا۔

''یہ بچہ بالکل سہیل کی مانند ہے بالکل اسی کی طرح کر رہا ہے۔''

''کون بچہ اور سہیل کون''

وہ کچھ دیر خاموش کھڑا پھولوں کو دیکھتا رہا اور پھر لمبا سانس لینے کے بعد بولا۔

وہی سہیل جو میری محبت کا قاتل ہے، جس نے میری دنیا لوٹ لی میری زندگی تباہ کر دی۔ جس نے مجھے اس اندھیرے غار میں زنجیروں کے ساتھ جکڑ کر دھکیل دیا۔ جہاں سے فرار ممکن ہی نہیں۔''

سہیل ہمارا کلاس فیلو تھا۔ خوش شکل، بہت امیر ماں باپ کا بیٹا۔ بد دماغ اور متکبر۔ ہماری کلاس کی سب لڑکیوں سے اس کی علیک سلیک تھی سوائے صائمہ کے۔ وہ اس کے سلام کا بھی بس واجبی سا جواب دیتی۔ وہ اس بات پر بہت تلملاتا کہ وہ اسے بالکل درخور اعتنا نہیں جانتی اور ہر وقت میرے ساتھ پھرتی ہے۔ ساری کلاس میں میری اور صائمہ کی محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ شاید اسے اس بات پر بھی غصہ آتا ہو کہ وہ اس کی دولت سے مرعوب نہیں، اور ایک سفید پوش لڑکے کی محبت میں بری طرح گرفتار ہے۔

جب ہمارے کورس ختم ہونے میں چھ ماہ رہ گئے تو اس لڑکے کا رویہ صائمہ سے نامناسب سا ہوگیا۔ اکثر اسے کلاس میں اور باہر گھورتا رہتا۔ دبے الفاظ میں اسے ڈرانے کی کوشش کرتا اور وہ اس سے سہمی سی رہنے لگی۔ مجھے اس نے سختی سے روکا ہوا تھا کہ میں نے کوئی بات سہیل سے نہیں کرنی۔

ایک دن وہ بہت پریشان حال کلاس میں آئی رات جاگنے اور رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''کل شام سہیل کے ماں باپ ہمارے گھر آئے تھے''

''مگر کیوں؟''

''میرا رشتہ مانگنے''

''اچھا، میرے خدایا رحم کرنا پھر تمھارے ابو، امی نے کیا کہا۔''

''انہوں نے کہا ہمیں چند دن سوچنے کا موقع دیں۔''

مجھے کچھ ہوش نہ رہ گیا اور نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

بس وہ دن اور آج کا دن اس کو مجھ سے بچھڑے چھ سال بیت گئے۔ میری زندگی کا چین سکون تب کا ختم ہو چکا۔

ان دونوں کی شادی ہمارا کورس ختم ہونے کے ہفتہ بعد ہوگئی۔

وہ بہت تڑپی بہت فریاد کی لیکن اس کے ماں باپ دولت کے قدموں پر سجدہ ریز ہو گئے۔

وہ دونوں امریکہ شفٹ ہو گئے۔ اس ظالم نے شادی کے چھ ماہ بعد ہی اسے طلاق دے دی۔ وہ اسے شروع دن سے کہتا کہ یہ شادی میں نے انتقاماً کی ہے اپنی انا کی تسکین کے لیے۔ ان چھ مہینوں میں سہیل نے اس کو بہت ستایا میرا کبھی کبھی اس سے فون پر رابطہ ہوتا تھا۔ پھر اچانک رابطہ ٹوٹ گیا۔ اس کی طلاق کے بعد۔

''رابطہ کیوں ٹوٹ گیا۔''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ طلاق کے بعد وہ کن حالات میں اور کیسے ہے میں نہیں جانتا۔ اس کے والدین بھی شادی کے بعد سے شہر چھوڑ گئے۔ میں کس سے معلوم کرتا۔''

وہ بس امریکہ کی فضاؤں میں کہیں گم ہو گئی۔

دونوں بچے بھاگتے ہوئے دوبارہ ان کے پاس سے گذرے۔ ''پلیز میرے غبارے دے دو۔ یہ پھٹ جائیں گے۔''

آگے بھاگتا بچہ اچانک ٹھوکر کھا کر گرا اور غبارے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بلند ہونے لگے۔

دوسرا بچہ۔ رکا اور زمین سے کئی بار اچھلا کہ اوپر فضا میں بلند ہوتے غباروں کو پکڑ پائے مگر ان سے بندھے سفید دھاگے کافی دور ہو چکے تھے۔ پھر وہ کھڑا ہو کر رونے لگا۔ وہ بھاگتا ہوا اس کے پاس گیا۔ اس کا سر چوما پیار کیا۔

''میرے بیٹے مت رو، یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ یہ خوشیوں کو چھین کر، تمھارے غباروں کی طرح اڑا دیتی ہے

مجرم

خوشی، بے چینی، تجسس یہ سب کیفیات اُس کے دماغ میں آ جا رہی تھیں۔ دفتر میں چند اور ساتھی اہلکار بھی اپنے کام میں مصروف تھے، اس نے سب کی نظر بچا کر اپنا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا اور اندر رکھے لفافے کو پکڑ کر تھوڑا سا باہر نکالا اور پھر واپس رکھ دیا۔ پچھلے پندرہ منٹ میں ایسا کئی بار کر چکا تھا۔ وہ بہت خوش تھا لیکن ساتھ ساتھ ہلکا سا پریشان بھی۔ لیکن پریشانی سے زیادہ اس کو بے چینی کہا جا سکتا تھا۔ اُس نے چند لمبے سانس لیے اور اپنے ڈیسک سے اٹھ کر اُس کھڑکی کے پاس آ گیا جو اس ہال کے ایک کنارے پر تھی۔ اس کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور باہر شہر کی عمارات نظر آ رہی تھیں اور نیلگوں صاف آسمان۔ فضا میں پالتو کبوتروں کا جھنڈ محوِ پرواز تھا۔ وہ کافی دیر کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ وہ اڑتے ہوئے ایک سمت کو جاتے اور پھر نیم دائرہ بناتے واپسی کو پرواز شروع کر دیتے اور پھر واپس۔

دفتر میں ہلکی خنکی تھی۔ باہر موسم بہت خوشگوار ہو گیا۔ اس نے کھڑکی سے ہٹتے ہوئے سوچا۔ واپس اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے اسے بوریت کا احساس ہونے لگا۔ اس کے ذمہ لگایا گیا ابھی کافی کام باقی تھا۔ میز پر فائیلوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا جسے اُس نے دیکھ کر اپنے افسر بالا کو بھیجنی تھیں۔ مگر اس کا دل کام کرنے کو بالکل نہیں کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ باہر نکھری دھوپ میں کچھ دیر سڑک پر بے مقصد مٹر گشت کی جائے اور پھر یہاں سے تقریباً ایک کلومیٹر پر واقع شہر کے مشہور ریسٹورنٹ سے کھانا کھایا جائے۔ اس دفتر میں نوکری شروع کئے اسے چھ سال گزر چکے تھے دفتر آتے اور جاتے وہ روزانہ اُسی ریسٹورنٹ کے سامنے سے گزرتا وہاں کھانا کھانے کی آرزو ہوتی لیکن اُن چھ سالوں میں فقط ایک ہی دفعہ اس نے کھانا کھایا، وہ بھی اس کا ایک امیر تاجر دوست اسے ملنے دفتر

آیا اور اسے دوپہر کے کھانے کے لیے ساتھ مدعو کر کے لے گیا۔ لیکن آج وہ جو چاہے کھا سکتا تھا۔ اُس نے کوٹ کی جیب میں رکھے لفافے کو تھپتھپایا اور دفتر سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا۔ تیز دھوپ کے سبب موسم واقعی بہت خوشگوار ہے۔ میں نے اس ٹھنڈے دفتر سے نکل کر ٹھیک ہی کیا ہے۔ ہاں اچھا تو بہت لگ رہا ہے لیکن ان فائیلوں کا کیا ہوگا جو صبح نو بجے سے پہلے صاحب کے دفتر بھیجنی ہیں۔ کل کی بات کل دیکھی جائے گی۔ آج کے دن کو کیوں خراب کیا جائے۔ لیکن میں کسی کو بتائے بنا اور کسی اجازت کے بغیر ہی چلا آیا ہوں اگر کسی آفیسر کو معلوم پڑ گیا تو کیا بہانہ کروں گا۔ یار کل کی بات آج پر مت ڈالو۔ چھوڑو سب، کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی میرے دفتر سے چند گھنٹے چھٹی کر لینے پر۔ حد ہوتی ہے کم ہمتی کی۔ دفتر میں کئی لوگ ہیں جو بغیر اجازت یا چھٹی لیے ہفتہ بھر کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کا تو کسی نے کبھی کچھ نہیں بگاڑا۔ میں کیوں چھوٹی سی بات پر پریشان ہوں۔"

اپنی سوچ میں گم وہ اُس ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ ایک لمحے کو وہ رکا اردگرد نگاہ کو گھمایا اور ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک خوشگوار مہک نے اس کا استقبال کیا۔ "جناب کیا آپ اکیلے ہیں" ایک ویٹر نے مودب لہجے میں سوال کیا۔ اس نے گھبرائے ہوئے اور سوال کو نہ سمجھتے ہوئے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جناب آپ سے پوچھ رہا تھا کہ آپ اکیلے ہیں یا کوئی اور مہمان بھی آئے گا۔

"نہیں کوئی اور نہیں آئے گا میں اکیلا ہی ہوں"

ویٹر اسے ساتھ لیے ایک ایسی میز تک لے آیا جہاں آمنے سامنے دو کرسیاں میز پر بچھے سفید کپڑے پر انتہائی نفیس چھری کانٹے اور چمچ خوبصورت ترتیب سے دھرے تھے اور ساتھ رکھے کرسٹل کے شفاف گلاسوں میں انتہائی اجلے نیپکن رول ہو کر پڑے تھے۔ ویٹر نے اسے بیٹھانے کے لیے کرسی کو پیچھے کھینچا۔ اور پھر ایک خوبصورت مینو کارڈ اس کے سامنے رکھنے کے بعد چلا گیا۔ کارڈ پر درج قیمتیں دیکھ کر وہ گھبرایا لیکن کچھ سوچ کر مسکرانے لگا۔ اس نے قیمت پر توجہ

دینے کی بجائے تین ڈشیں پسند کر کے کھانا منگوایا اور ساتھ اپنی بیوی اور بیٹے کے لیے گھر بھی لے گیا۔

وہ ایک سرکاری دفتر میں ہیڈ کلرک تھا اور اسکی ماہانہ تنخواہ بیس ہزار تھی۔ایک ماہ قبل اس کا تبادلہ میونسپل کارپوریشن میں ہوا تھا اور ایک دوست کی سفارش سے ایک اہم ڈیسک پر اس کی ڈیوٹی لگ گئی۔اس تعیناتی پر دفتر والوں نے اسے بہت مبارک باد دی۔اسے ایسا لگا جیسے نئی نوکری ملی ہو۔ ایک آدھ دن تو اسے سمجھ نہ آئی کہ لوگ اسے اتنی مبارک کیوں دے رہے ہیں۔کمال ہے۔لوگوں میں دکھانے کو بھی شرافت نہیں رہ گئی۔جہاں رشوت ملتی ہو اس تعیناتی پر احباب خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔مبارکبادد ینی شروع کر دیتے ہیں۔اس نے گھر آکر بیوی سے کہا۔

"رشوت اگر اس دفتر میں ملتی ہے تو تمھارا کیا قصور ہے۔کئی دفتر ہوتے ہیں جہاں رشوت لینا برائی نہیں ہوتی" اس کی بیوی نے جواباً کہا۔اسے بڑا غصہ آیا۔

"تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا۔جو برائی ہے وہ برائی ہی رہتی ہے چاہے اسے کوئی برا سمجھے یا نہ سمجھے۔"

"اب زمانہ بدل گیا ہے۔پہلے وقت میں رشوت لینا برا ہوتا ہوگا، اب تو سب لے رہے ہیں۔جن کو نہیں ملتی وہ ایماندار بنے پھر رہے ہیں۔ہمارے ہم سائے کو دیکھو وہ بھی کلرک ہے، کیسا زبردست رہن سہن ہے، اور کار بھی بالکل نئی۔جس برائی کی معاشرے میں روک ٹوک نہ ہو وہ چیز برائی نہیں سمجھی جاتی، اور پھر وہ برائی مانی بھی نہیں جاتی۔کہتے ہیں انگریز کے وقت میں اور ملک بننے کے چند سال بعد تک رشوت برائی تھی۔کیونکہ اس وقت اسے برا سمجھا جاتا اور سخت پکڑ ہوتی۔"

"تم اتنی ہوش مند اور پڑھی لکھی ہو کر ایسی بات کر رہی ہو۔"

اس نے ناراض ہوتے ہوئے بیوی سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے جو مرضی کرو۔دفتر سے آتے ساتھ میرا دماغ مت کھاؤ اور رشوت لو یا نہ لو اگلے ماہ سے مجھے گھر کے خرچ کے لیے تیس ہزار چاہیے۔ورنہ میں اپنے بیٹے کو لے کر میکے چلی

جاؤں گی۔" ریسٹورنٹ سے نکل کر اس نے گھر جانے کے لیے ٹیکسی لی۔کافی دنوں کی ذہنی کش مکش کے بعد آج اس نے اپنے دوست کی بات مان کر ایک مکان کا نقشہ منظور کرنے کا پچاس ہزار لیا تھا۔ یہ رقم اس کی ماہانہ تنخواہ سے ڈھائی گنا تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ ضمیر کی ملامت کچھ کہہ رہی تھی لیکن بہت آہستہ۔

"یہ کھانا کہاں سے آ گیا صبح تو مجھے دینے کے لیے تمھارے پاس پیسے نہیں تھے"

"اب پیسوں کی فکر مت کرنا۔ میں نے تمھاری تجویز پر عمل کرنے کا سوچا ہے۔ یہاں سب مال بنا رہے ہیں۔ اگر کچھ مجھے بھی مل گیا تو کون سے ہماری آزادی چھن جائے گی"

"یہ ہوئی نہ مردوں والی بات"

آہستہ آہستہ اس کے پاس رقم جمع ہونی شروع ہوگئی۔ پرانا گھر بدل کر کرائے پر بہتر گھر لے لیا۔ فرنیچر اور ایئر کنڈیشنز آ گئے۔ ایک سال بعد اس نے ایک چھوٹی گاڑی بھی خرید لی۔ زندگی سے غربت کی کڑواہٹ چلی گئی۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ مفلسی کے دن کوئی برا خواب تھا یا یہ آسائش کوئی وہم ہے۔ آہستہ آہستہ اسے غریبی کے دن بھولتے چلے گئے۔

ایک چیز وہ ذہن سے نہ نکال سکا کہ جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا تو اس کے ماں باپ گاؤں میں رہتے تھے اور وہ لاہور میں اپنے رشتہ داروں کے گھر رہتا۔ اسے اکثر سکول جاتے ہوئے فقط بس کا آنے اور جانے کا کرایہ ہی ملتا۔

دوپہر کو جب آدھ گھنٹے کی بریک ہوتی تو اکثر بچے اپنے گھر سے ساتھ لایا کھانا کھاتے یا کینٹین سے فروٹ نان چنے یا سموسے لے کر کھا رہے ہوتے۔ وہ گھر سے نہ کھانا ساتھ لاتا اور نہ اسے بس کے کرائے کے علاوہ کچھ ملتا۔ کئی دفعہ وہ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر واپسی کے بس کرائے سے نان اور چنے خرید کر کھا لیتا۔ پیٹ بھرنے کے بعد اسے فکر دامن گیر ہوتی کہ واپس کیسے جاؤنگا۔ اس زمانے میں لاہور میں ڈبل ڈیکر بسیں بھی چلتی تھیں۔ وہ کوشش کرتا کہ ڈبل ڈیکر بس میں سوار ہو۔ ٹکٹ چیکر سے بچنے کے لیے کبھی وہ اوپر والی منزل پر چلا جاتا اور کبھی نیچے آ جاتا

اور کبھی کبھار سیڑھیوں کے نیچے بنے کیبن میں چھپ جاتا۔ اس اندھیرے میں اس کا ننھا دل بہت گھبراتا لیکن کوئی چارہ نہ ہوتا۔ اور وہ وہیں کھڑا بس کے رکنے اور چلنے سے اندازہ لگا لیتا کہ اس نے کس اسٹاپ پر بس سے اترنا ہے۔ کئی دفعہ ٹکٹ چیکر ٹکٹ نہ ہونے پر اسے ڈانٹ کر بس سے اتار دیتا۔ وہ تکلیف دہ دن کبھی ذہن سے نکال نہ سکا۔

اس کے تین بچے تھے ایک بیٹی اور دو بیٹے۔ وہ ان کا بہت خیال رکھتا۔ بچپن کے اوائل کے دن تو ان کے غربت میں ہی گزرے لیکن جوانی میں پاؤں رکھنے سے قبل بچوں نے امیری کو دبے پاؤں گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے چھوٹے بیٹے کو غربت یاد نہ تھی۔ چھٹیوں میں ملک کے طول و عرض کی سیر بہترین ہوٹلوں میں قیام اعلیٰ کپڑے دل پسند کھلونے، جیب خرچ کے لیے معقول پیسے، وہ چاہتا تھا کہ اس کے بچوں کے ذہن میں کوئی احساس محرومی نہ ہو۔ وہ اپنے بچپن سے خوب لطف اٹھائیں۔

وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہتا کہ انسان کے خود امیر ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ امیر والدین کے گھر پیدا ہوا جائے۔ کیونکہ غربت سے امیری کے سفر میں لطف اٹھانے کی منزل اور عمر ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔

محکمانہ ترقی تو اسے کچھ خاص نہ ملی پچھلے بیس سال میں وہ ہیڈ کلرک سے فقط اسسٹنٹ ڈائریکٹر تک پہنچ پایا۔ اس بات کی طرف اس نے کبھی خاص توجہ نہ دی تھی۔ تقریباً پندرہ سال قبل وہ میونسپل کارپوریشن کا مستقل ملازم ہو چکا تھا۔ اس سے قبل وہ محکمہ شماریات میں کام کیا کرتا تھا۔ محکمانہ ترقی میں اس کے بیشتر ساتھی آگے نکل گئے تھے لیکن وہ یہ سوچ کا اطمینان پا لیتا کہ روپے پیسے اور جائیداد بنانے میں وہ سب سے آگے نکل گیا۔ کئی خیر خواہ پرانے دوست اسے مشورہ دیتے کہ احتیاط سے کام کیا کرے اور جائیداد جو نظر آنا شروع ہو گئی ہے اس کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔

جائیداد اور اسباب کی موجودگی اعتماد اور ہمت بڑھا دیتی ہے اس لیے اس کی ڈگر میں کوئی

فرق نہ آیا اور اب وہ مشورہ دینے والے دوستوں کو حاسد اور بدخواہ سمجھتا۔
اس نے اپنی بیٹی کی چند سال قبل بڑے دھوم سے شادی کر دی تھی۔ بڑا بیٹا دو سال قبل ساؤتھ افریقہ چلا گیا۔ وہاں اس نے کاروں کا وسیع کاروبار شروع کر لیا۔ وہ جاپان سے نئی اور استعمال شدہ گاڑیاں درآمد کرتا اور ساؤتھ افریقہ کے علاوہ کئی ہمسایہ ملکوں میں فروخت کرتا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے بیٹے کو کاروبار کے لیے پانچ کروڑ روپے دیئے ہیں۔ جو سنتا اس کی آنکھیں حیرت سے کھل جاتیں۔ چھوٹے بیٹے کو بھی اس نے پچھلے سال کچھ رقم دے کر بڑے بھائی کے پاس بھیج دیا۔
دونوں بھائی زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر پائے تھے۔ شاید تربیت کا فقدان اس کا سبب بنا۔
اب دونوں میاں بیوی وسیع گھر میں اکیلے رہتے۔ ان کا اسلام آباد میں بھی ایک خوبصورت گھر تھا۔ جسے اس نے ایک غیر ملکی کو کرائے پر دے رکھا تھا۔
"کل دوپہر احتساب بیورو کا ایک افسر میرے پاس آیا تھا وہ پچھلے پانچ سال کا بینک اکاؤنٹ مانگ رہا تھا، آپ کا اور آپ کی اہلیہ کا"
بنک منیجر نے چائے بنانے کے بعد کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اسے اطلاع دی۔
"کیوں مانگ رہے تھے۔ کیا تعلق ان کا ہمارے اکاؤنٹ سے۔" اس نے گھبرا کر پوچھا۔
"سر! میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیوں مانگ رہے تھے لیکن میرے خیال میں ان کا محکمہ قانوناً اس بات کا اختیار رکھتا ہے"
"کیا آپ نے معلومات دے دیں"
"نہیں میں نے دو دن کا ٹائم مانگا ہے تاکہ اپنے ہیڈ آفس سے اجازت لے لوں، کیونکہ بنک اکاؤنٹ ہولڈر کے علاوہ کسی کو معلومات فراہم نہیں کر سکتا"
"آپ مجھے میرا اور میری زوجہ کا بیلنس بتایئے"
وہ اب مکمل حواس باختہ لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کمپیوٹر کو استعمال کرنے کے بعد منیجر نے اسے بتایا کہ اس کے اکاؤنٹ میں بیس لاکھ اور اس کی زوجہ کے اکتیس لاکھ ساٹھ ہزار روپے پڑے

ہیں۔

''میرے خدایا یہ بہت براہوا''

''کیا آپ کسی طرح اس محکمے کو معلومات فراہم کرنے سے انکار کر سکتے ہیں کسی بھی شرط پر میں آپ کو اس کے عوض اچھی رقم دینے کو تیار ہوں''

اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

چائے سے اڑتی بھاپ کافی دیر کی غائب ہو چکی تھی اور ٹھنڈی پڑنے کے بعد اس پر گہرے رنگ کی پپڑی جم گئی تھی۔

''ہم دونوں کے اکاؤنٹ میں ترپین لاکھ سے کچھ زیادہ رقم موجود ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ اب کیا ہوگا''

''سر آپ کیوں گھبرا رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا اس سے کہیں زیادہ پیسہ ہمارے بینک میں موجود ہے''

''ہوگا ان کے پاس، لیکن میرے پاس اتنی رقم کا کوئی قانونی اور جائز جواز موجود نہیں۔ مجھ سے جواب طلب کیا جا سکتا ہے کہ یہ ساری رقم میں نے کیسے اور کہاں سے لی''

''پچھلے سال آپ کو یاد ہوگا میں نے ڈیڑھ کروڑ روپے اپنے بیٹے کو ساؤتھ افریقہ بھیجے تھے۔ ہنڈی کے ذریعے، وہ شخص آپ نے ہی مجھے متعارف کروایا تھا۔ بظاہر دیانت دار اور اچھا آدمی معلوم پڑتا ہے۔''

''جناب اس کے بارے میں آپ فکر مند نہ ہوں کیونکہ وہ نقد رقم آپ نے دی تھی اور ہنڈی کے ذریعے باہر چلی گئی اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ آپ نے دو سال پہلے بھی چند کروڑ بیٹے کو بھجوائے تھے۔ آپ اس طرف سے تسلی رکھیں یہ بات میرے اور آپ کے درمیان ہے۔''

وہ گھبراہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ منیجر سے مصافحہ کر کے گاڑی میں آن بیٹھا۔ اب اسے یاد آیا کہ وہ بینک سے کچھ رقم نکلوانے آیا تھا لیکن دوبارہ بنک جانے کا اسے حوصلہ نہ ہوا اور اس نے

ڈرائیور کو گھر چلنے کا کہا۔

اس دفتر میں نوکری کرتے اسے بیس سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔آج دو بجے بعد دوپہر اسے احتساب بیورو کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے اپنے دفتر طلب کیا تھا۔آج سے قبل پچھلے دو ماہ میں وہ تین بار احتساب بیورو کے دفتر طلب کیا جا چکا تھا۔انسدادِ رشوت ستانی ایکٹ کے تحت اس پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔اس کی دو عدد کوٹھیاں پچاس ایکڑ زرعی زمین قیمتی دو گاڑیاں اور بھاری بینک بیلنس اس کی گردن کا پھندہ بنا ہوا تھا۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھا گھڑی دیکھی ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔وہ دفتر کی کھڑکی کے پاس چلا آیا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ نیچے شہر کی عمارات نظر آ رہی تھیں۔خوشگوار دھوپ چمک رہی تھی۔مختلف پرندے آسمان کی وسعتوں میں محو پرواز تھے۔اسے نہ دھوپ سے لگاؤ تھا نہ دفتر کے اندر کی خنکی محسوس ہوئی۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہیں ایک دم غائب ہو جاؤں کسی کو معلوم نہ پڑے کدھر گیا۔کیا زندگی اتنی بے لذت اور بے کیف بھی ہو سکتی ہے۔دنیاوی ہر نعمت کے ہوتے، سکون و اطمینان ایسے بھی گم ہو سکتا ہے۔یہ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔اسے سب سے زیادہ صدمہ اور غم بیٹوں کے رویئے سے ہوا۔دو ہفتے قبل اسے احتساب بیورو کے آفیسر نے بتایا کہ اس کے خلاف کروڑوں روپے کی خرد برد اور اختیارات کے ناجائز استعمال سے پیسہ کمانے کے الزامات ثابت ہو چکے ہیں۔اس کے دونوں گھر اور بینک میں موجود رقم بحق سرکار ضبط کر لی جائے گی اور اگر وہ ایک کروڑ روپیہ خزانہ میں جمع کروا دے تو اسے فقط نوکری سے برطرف کیا جائے گا اور اگر ایک کروڑ کی رقم سرکاری خزانہ میں جمع نہ کروائی گی تو کم از کم پانچ سال قید ہو گی۔

اس نے اپنے بیٹوں سے رابطہ کیا۔اس کے حساب کے مطابق پچھلے چند سالوں میں وہ انہیں چار کروڑ روپے سے زیادہ بھجوا چکا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اتنا ہی وہ منافع بھی کما چکے ہوں گے۔

چھوٹے بھائی کو بہت فکر لاحق تھی کہ کہیں باپ گرفتار ہی نہ ہو جائے۔دونوں نے مشورہ کیا کہ باپ کی کی امداد کی جائے۔

''ابا جان کو کل ہی ہمیں ایک کروڑ بھیج دینا چاہیے بلکہ ڈیڑھ کروڑ ہنڈی سے بھیج دیں میں نے سنا ہے ان کا بنک اکاؤنٹ منجمد کر دیا گیا ہے''

''ابھی ہم رقم کا بندوبست نہیں کر سکتے۔تم ناسمجھ ہو تمھیں کاروباری پیچیدگیوں کا تجربہ نہیں''

''لیکن بھائی ہمیں اپنے والد کے متعلق سوچنا چاہیے آج ہم جو ہیں سب ان کی مہربانی اور محنت کے سبب ہے''

''کون سی محنت برخوردار'' وہ ہلکا سا مسکرا کر بولا۔

''چند ماہ بعد کچھ رقم کا بندوبست کر دیں گے۔ابھی ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ورنہ ہمارے ترقی کرتے کاروبار کو دھچکا لگے گا''

چھوٹا بیٹا چاہتے ہوئے بھی باپ کی مدد سے قاصر تھا کیونکہ کل رقم ان کے مشترکہ اکاؤنٹ میں تھی۔

دو دن قبل اس کے بیٹے نے پیسے بھیجنے سے معذرت کر لی تھی۔اسے بیٹوں کے رویئے سے بہت دکھ پہنچا اور وہ رات کا بیشتر حصہ روتا رہا۔وہ بہت دیر خیالوں میں گم کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ ذہن بالکل خالی تھا۔کتنا خوشگوار دن تھا مدتوں پہلے جب وہ اسی کھڑکی کے پاس کھڑا کوٹ کی جیب میں رکھے لفافے میں رکھی زندگی کی پہلی رشوت پر خوش ہو رہا تھا۔کاش وہ دن نہ آیا ہوتا۔اسی لفافے نے میرا سکون اور بیٹے بھی چھین لیے۔اب جو ہونا تھا ہو چکا،چلو احتساب بیورو کے دفتر چلو۔وہ اپنے سے خود کلامی کرتا سڑک پر آ گیا۔وہاں سے اس نے ٹیکسی لی اور احتساب بیورو کے دفتر روانہ ہو گیا۔وہ اس دفتر اپنی ذاتی کار پر نہیں جاتا تھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں میرے سے ایک کروڑ روپیہ سرکاری خزانے میں جمع کروانے کا بندوبست نہیں ہو سکے گا''۔

''ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔کل سے تمھارا کیس عدالت میں شروع ہو جائے گا۔ ثبوت ہمارے پاس مکمل ہیں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہو گی''۔

اس کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا اور دل کی دھڑکن اچانک تیز ہوگئی۔

"میرا خیال ہے تمھیں کم از کم پانچ سال قید کی سزا ہوگی یا اس سے زیادہ۔"

اس کا دل اور تیز ہوا اور پھر اچانک رُک گیا۔

وہ دل جو ضمیر کا بوجھ اٹھائے برسوں دھڑکتا رہا خوف کو زیادہ دیر برداشت نہ کر پایا تھا۔

راز

وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے لوہار کی دکان میں بیٹھا تھا۔ دکان میں نیم تاریکی تھی۔ شام ہونے میں ابھی کافی وقت تھا لیکن بادل اتنے گھرے تھے کہ شام کا گمان ہونے لگا تھا۔ ادھر کچھ روشنی تھی جدھر بوڑھا لوہار بھٹی جلا کر بیٹھا تھا۔ جب وہ پھونکنی سے ہوا دیتا تو دکان میں روشنی کچھ بڑھ جاتی۔ پھونکنی چھوڑ کر وہ نعل پر ہتھوڑی مارنے لگتا۔

ٹھک ٹھک ٹھک ۔۔۔۔۔۔ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔ گرم لوہا جو انگارے کی طرح سرخ تھا اس سے چھوٹی چنگاریاں اڑنے لگتیں۔ اسے ایک پہاڑی گاؤں جانا تھا جدھر کا راستہ پتھریلا تھا۔ دوپہر کو جب وہ اپنے گھوڑے پر زین ڈالنے لگا تو اس نے گھوڑے کے چاروں پیروں کا معائنہ کیا کیونکہ اس راستے پر گھوڑے کے نعلوں کا بہتر اور اچھی حالت میں ہونا ضروری تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ گھوڑے کا اگلا دایاں نعل بہت گھس چکا ہے اور ویسے بھی ڈھیلا پڑ چکا تھا اور راستے میں کسی جگہ گر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اس پتھریلے راستے پر گھوڑے کے پاؤں کا زخمی ہو جانا یقینی تھا۔ اس لیے وہ گھنٹہ بھر سے لوہار کی دکان میں بیٹھا نیا نعل بنوا رہا تھا۔ گھرے بادل ہونے کے سبب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ آج کی بجائے وہ اس پہاڑی گاؤں کل جائے گا۔

پھونکنی سے آگ اچھی طرح دہکانے کے بعد بوڑھے لوہار نے وہ لوہے کا ٹکڑا جو سرخ ہو چکا تھا، بھٹی سے باہر نکالا اور سامنے رکھے ایک لوہے کے چوکور بڑے سے ٹکڑے پر ایک لمبے سے اوزار کی مدد سے رکھا۔ وہ اسی لوہے کے چمٹا نما اوزار سے ہی لوہے کو پکڑ کر آگ میں گرم کر رہا تھا۔ چوکور لوہے پر نعل والا لوہا رکھنے کے بعد وہ پھر ہتھوڑی چلانے لگا اسی تسلسل کے ساتھ۔ ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک ۔۔۔۔۔۔ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک ۔۔۔ وہ ٹھک ٹھک کی آواز کو نہ صرف بڑے غور سے

سن رہا تھا بلکہ ہتھوڑی کی ہر ضرب کو غور سے دیکھ بھی رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ لوہے کا ٹکڑا نعل اسپ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اور اب لوہار کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس کا کام اختتام کے قریب ہے۔ وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کے گھوڑے کا نعل تقریباً تیار ہو چکا ہے لیکن اب اُسے اس بات کی فکر نہ تھی کہ نعل کتنی دیر میں یا کیسا تیار ہو رہا ہے۔

اسے الجھن اس بات سے ہو رہی تھی کہ بوڑھے لوہار کہ ہتھوڑی کی ضربوں میں تیسری اور چوتھی ضرب میں لمحوں کا فرق ہے۔ ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔ ٹھک ٹھک۔ وہ مسلسل اسی بات پر غور کر رہا تھا۔ جب لوہار نے نعل کو مکمل کرنے کے بعد ساتھ رکھے پانی کے ایک پرانے سے ٹب میں اسے غوطہ دیا جس سے ہلکی سی آواز کے ساتھ بھاپ اٹھی اور پھر اُس نے نعل کو پانی سے نکال کر زمین پر رکھ دیا۔ ''آئیں گھوڑے کو نعل لگا دوں'' لیکن وہ خاموش بیٹھا بھٹی کی مدھم پڑتی آگ کو دیکھتے ہوئے ٹھک۔۔۔ ٹھک کے وقفے پر مسلسل غور کرنے میں ڈوبا رہا۔

برخوردار آؤ تمھارے گھوڑے کے نعل لگا دوں دیکھو کتنا عمدہ بنایا ہے میں نے اور تم کمزور پڑتی آگ میں کیا تلاش کر رہے ہو؟ بوڑھے لوہار نے شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے چونک کر لوہار کو دیکھا نعل گھوڑے کو لگانے سے قبل مجھے آپ یہ بتائیں کہ آپ گرم لوہے پر چار ضربیں لگاتے پھر چار۔ میرے دو سوال ہیں پہلا یہ کہ آپ ہر دفعہ چار ضربوں کے بعد تھوڑا وقفہ پھر چار لگاتے، چار کی بجائے پانچ یا چھ کیوں نہیں اور دوسرا سوال ہے کہ آپ کی پہلی اور دوسری ضرب اور تیسری ضرب میں معمولی سا وقفہ ہوتا ہے جتنی دیر ہاتھ کو اوپر جا کر واپس آنے میں لگتی ہے لیکن تیسری اور چوتھی ضرب میں وقفہ کچھ زیادہ ہے بانسبت دوسری اور تیسری کے اس کی وجہ کیا ہے؟

چار ضربیں میں اس لیے لگاتا ہوں کہ میں نے اپنے باپ کو ہمیشہ ایسا کرتے ہوئے دیکھا۔ جب میں نے آہن گری کا کام سیکھا تو میرے ذہن میں بیٹھ گیا کہ چار ضربوں کا تسلسل معمولی وقفہ اور پھر چار ضربیں۔ چنانچہ بنا سوچے ہاتھ ایسے ہی حرکت کرتے ہیں۔ رہ گیا دوسرا سوال کہ

تیسری اور چوتھی ضرب میں وقفہ کیوں۔ وقفہ بالکل نہیں ہے فقط تمہیں محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے تو آج تک ایسا نہیں لگا، اسی کام میں میری عمر گذر گئی۔ چاروں ضربوں میں وقفہ برابر ہے۔ ''نہیں ایسا نہیں ہے تیسری اور چوتھی ضرب میں معمولی وقفہ ہے جو پہلی تین ضربوں میں نہیں''

''چلو ایسا اگر ہے بھی تو اُس سے مجھے یا تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ آؤ باہر تمھارے گھوڑے کو نعل لگا دوں۔ ''تمہیں بھی جلدی ہوگی اور میرا خیال ہے جتنے سیاہ اور بوجھل بادل چھا چکے ہیں زور کا مینہ برسے گا۔ میں چاہتا ہوں بارش آنے سے قبل اپنی دکان بند کر کے گھر چلا جاؤں۔ میرا گھر گاؤں کے مغربی کنارے پر واقع ہے''۔ بوڑھے لوہار نے چھوٹا ہتھوڑا چند کیل اور نیا بنا نعل ہاتھ میں پکڑے دکان سے باہر کھڑے گھوڑے کی جانب چلتے ہوئے اسے کہا ''لیکن جب تک تم مجھے مطمئن نہیں کرو گے کہ تیسری اور چوتھی ضرب میں معمولی وقفہ کیوں میں تمھاری دکان سے نہیں جاؤں گا۔''

اب بوڑھے لوہار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنا چاہا لیکن کم روشنی کی وجہ سے وہ کچھ سمجھ نہ پایا۔ تم اس طرح کر و گھوڑے کو نعل لگوا کر چلے جاؤ علی الصبح آ جانا اس موضوع پر بات کریں گے مجھے بھی کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ تیسری اور چوتھی ضرب میں غیر محسوس وقفہ ہے جو پہلی تین ضربوں میں نہیں''

''ہاں اب تم نے درست بات کی۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں اتنا تجربہ کار اور پڑھا لکھا ہوں میرا مشاہدہ غلط کیسے ہوسکتا ہے''

''بالکل تمھارا مشاہدہ زبردست ہے جس نے مجھے مات دے دی'' بوڑھا لوہار طنزاً مسکرایا۔ اس نے نعل کی قیمت ادا کی اور صبح آنے کا کہہ کر گھوڑے کی لگام پکڑ کر پیدل ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

لوہار نے کچھ ہی دیر پہلے دکان کھولی اس کا ایک ہمسایہ اس کے ساتھ ہی گھر سے آیا جس نے اپنے ہل کی مرمت کروانی تھی۔ ساری رات بارش برسی تھی اور ابھی بھی آسمان صاف نہ ہوا

تھا۔صبح کی ہوا میں خنکی کا عنصر نمایاں تھا۔

اپنی بھٹی میں آگ روشن کر کے وہ پھونکنی کی سمت درست کر رہا تھا کہ وہ آن دھمکا۔ بوڑھے نے ایک ناگواری مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کل والے احمقانہ سوالات دھرائے اس نے ساتھ بیٹھے بندہ کا تعارف کروایا اور بتایا کہ اسے ہل ٹھیک کروانے کی جلدی ہے وہ چلا جائے تو کل والی بات شروع کریں گے وہ بادل نخواستہ مان گیا۔

لوہار نے لکڑی کے ہل سے لوہے کا پھالا الگ کیا اور اسے بھٹی میں سرخ کرنے کے بعد اسی چوکور لوہے کے ٹکڑے پر رکھ کر ہتھوڑے سے ضربیں لگانے لگا۔

وہ فوراً متوجہ ہو کر ٹھک ٹھک پر غور کرنے لگا بلکہ جس شخص کا ہل تھا اس کو بھی اس نے ہدایت کی کہ توجہ سے ہتھوڑے کی ضربوں کی آواز سنے۔

کچھ دیر بعد اُس نے ہل والے دیہاتی سے پوچھا کہ آیا تیسری اور چوتھی ضرب کے درمیان پہلی تین کی نسبت وقفہ ہے کہ نہیں۔ وہ بھی غور کرنے لگا اور کافی دیر متواتر سننے کے بعد جواب دیا کہ کوئی فرق نہیں وہ ناراض ہو کر اسے گھورنے لگا۔

''یہ شخص کون ہے اور ایسے مجھے کیسے گھور سکتا ہے''اس دیہاتی نے بگڑتے ہوئے بوڑھے لوہار سے پوچھا۔

''میں خود بھی نہیں جانتا کل شام میرے پاس اپنے گھوڑے کی ایک نعل درست کروانے آیا تھا۔شاید یہاں کسی کا مہمان ہے''۔

ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں یہاں پروفیسر علی صاحب کا مہمان ہوں جو یہاں کے واحد پڑھے لکھے اور سمجھدار انسان ہیں۔ مجھے حیرت ہے وہ اس گاؤں اور یہاں کے لوگوں میں کیسے رہ رہے ہیں۔

''جوان میں آج مصروف ہوں اور اگر مصروف نہ بھی ہوتا تو تمھارے رویئے کی وجہ سے تم سے کوئی گفتگو نہیں کر سکتا اور اگر تیسری اور چوتھی ضرب میں کوئی وقفہ ہے یا نہیں مجھے اُس سے کوئی

سروکار نہیں''

وہ غصے سے اٹھا اور دکان سے نکل گیا۔ "علی الصبح کدھر چلے گئے تھے تم، میں ناشتہ تمھارے ساتھ اکٹھا کرنا چاہتا تھا۔ پروفیسر علی نے اسے بیٹھک میں داخل ہوتے ہی کہا۔ سر رات بھی آپ سے بہت دیر بات ہوئی ٹھک ٹھک کے موضوع پر میں اتنی صبح اسی بوڑھے لوہار کی دکان پر گیا تھا جہاں کل زندگی کا یہ اہم ترین راز مجھ پر آشکار ہوا۔ ہم پہلے ناشتہ کرتے ہیں پھر زندگی کے اس اہم راز سے پردہ اٹھتا دیکھیں گے۔ پروفیسر کو اپنے اس پرانے اسٹوڈنٹ کے حالات معلوم تھے کہ کیسے وہ ایم اے فلاسفی کے امتحان میں فیل ہونے کے بعد چند سال پاگل خانے میں گزار چکا تھا۔ انہیں خطرہ پیدا ہوا کہ پھر کہیں اس کی دماغی حالت نہ بگڑ جائے۔

پروفیسر صاحب ناشتے میں کیا رکھا ہے آپ نے ہزاروں طالب علموں کو فلسفہ پڑھایا مجھے سمجھائیں ٹھک ٹھک اور ٹھک ٹھک ٹھک۔۔۔۔ ٹھک میں کیا راز زندگی پنہاں ہے اور اگر آپ ابھی نہ بتا پائے تو میں آپ کو جعلی پروفیسر اور شعبدہ باز انسان سمجھوں گا جو ٹھک ٹھک جسے بڑے راز حیات سے واقف نہیں۔ سر کیا آپ اس راز حیات کو جانتے ہیں یا فقط میں ہی دنیا کا وہ واحد شخص ہوں جو اس ابدی حقیقت کو جان پایا ہوں۔ اور وہ بھی ایک بوڑھے لوہار کی گھٹیا سی جگہ پر۔ کمال ہو گیا۔ الجھن یہ ہے کہ اس بے حس اور ذہنی مفلوج دنیا والوں کو سمجھاؤں کیسے جو کچھ میرا ذہن مجھے دیکھا رہا ہے۔

پروفیسر صاحب اگر ایک صورت حال اور کیفیت آپ کے دل و دماغ پر آشکار کر دی جائے یا ظاہر ہو جائے۔ آپ اسے نہ صرف پوری ہوش مندی سے جان چکے ہوں، آپ کو سمجھ آ جائے لیکن زبان اسے بیان کرنے سے اور ہاتھ اسے لکھنے سے قاصر اور مفلوج ہوں تو کیسی اضطرابی حالت ہو گی، جبکہ آپ دوسرے لوگوں کو بتانا اور سمجھانا چاہتے ہوں۔ جو سمجھ آپ کو آ چکی ہے۔ اسی حالت بے بسی کو کیا کہا جائے گا۔ کیا آپ میری اس سلسلے میں کچھ رہنمائی کر سکتے ہیں کہ میں اپنے دل و دماغ میں بسے تصورات اور احساس کو کیسے بیان کروں۔ وہ الفاظ کیسے ڈھونڈوں دماغ اور

ہاتھ کا یا دماغ اور زبان کا رابطہ کیسے استوار کروں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اگر تصورات کا وہ ہجوم میرے دماغ میں ایسے ہی بڑھتا رہا اور میں اس کو بیان نہ کر سکا تو یہ خیال اور فہم کی یلغار مجھے پاگل یا ہلاک کر دے گی۔"

پروفیسر پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے گھر والے اسے مورد الزام ٹھہرائیں گے کہ اس کے گھر گیا تھا نا جانے کیا بتایا کہ اس کا دماغ پھر الٹ گیا۔

"پروفیسر صاحب اب مجھے ناشتہ وغیرہ نہیں کرنا۔ میں جا رہا ہوں اور پھر بغیر ہاتھ ملائے باہر نکل گیا۔ پروفیسر نے گھر سے باہر نکل کر دیکھا اس کا گھوڑا باہر درخت کے ساتھ بندھا تھا اور وہ پیدل جا رہا تھا۔

"اپنا گھوڑا تو لیتے جاؤ"

"نہیں اب مجھے اس دنیا کی کسی واہیات شے کی ضرورت نہیں۔ میں ہر چیز سے ماورا ہو چکا ہوں۔ سب بکواس، سب فضول ہے بس وہی ازلی راز ارفع و اعلیٰ ہے۔"

نمک خوار

عمر کے سبب اس کا ٹیڑھا اور موٹا تنا کچھ کھوکھلا ہو گیا تھا لیکن وہ گھنا ابھی بھی اتنا ہی تھا جتنا وہ اس کے بچپن میں ہوتا تھا۔ تنے پر ابھار بن گئے تھے اور کچھ بدوضع سا ہو گیا تھا، جیسے بڑھاپے میں انسان کے ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ گھنا سایہ اس کے جوان ہونے کی گواہی دیتا لیکن اس پر پیلوں کا نہ لگنا اور تنے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔

ان کی حویلی اور مہمان خانے کے درمیان تقریباً سو گز فاصلہ ہوگا اور وہ درخت درمیان میں تھا۔ ان کے ملازم اس کے نیچے بھی صفائی کر کے چند کرسیاں رکھ دیتے بجلی نہ ہونے کی صورت میں گرم دوپہر کو اس کا گہرا سایہ غنیمت ہوتا۔ اس کے والد اور آئے ہوئے مہمان اسی کے نیچے وقت گزارتے۔

وہ حویلی سے نکلا اور مہمان خانے کی طرف چل پڑا۔ گرمی نہ تھی لیکن پھر بھی چھاؤں نظروں کو اچھی لگتی۔ درخت کے نیچے چند کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ لمحہ بھر کو رکا اور پھر ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ بچپن میں گھنٹوں اپنے دوستوں کے ساتھ اس درخت کے نیچے کھیلتا رہتا۔ ان کی حویلی اور مہمان خانے کے کسی درخت کا سایہ اس جیسا گھنا نہیں تھا۔ جب سورج عین اس کے اوپر چمک رہا ہوتا پھر بھی کوئی کرن شاخوں اور پتوں سے آنکھ بچا کر زمین پر نہ پہنچ پاتی۔

گاؤں کی مشرقی طرف ان کا گھر پہلے آتا اور اس سے آگے دوسرے گھروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا لیکن وہ گاؤں کے گھروں میں ایسے تھا جیسے انسانوں میں دیو کھڑا ہو۔ اس حویلی کی مکانیت سے دوسرے گھروں کا کوئی جوڑ نہ تھا۔ اس نے کرسی کو پیچھے کی طرف جھکایا اور اوپر درخت کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک بہت بڑی چھتری کی طرح تھا۔ بالکل گول، چند گھونسلے گھنی شاخوں

میں بنے تھے اور چڑیاں گھونسلوں کے اندر اور ارد گرد بیٹھی تھیں۔ کافی دیر وہ دیکھتا رہا، رنگ برنگی پیلوں جو کبھی بہتات سے اس پر لگتیں اب ایک بھی نہ تھی حالانکہ ان کا موسم تھا۔

گاؤں کے جنوب مشرقی طرف ایک ٹیلا تھا۔ جو قدِ آدم سے کچھ زیادہ ہوگا اور پھیلاؤ میں چند کنال۔ اس پر اسی درخت جیسے ''ون'' کے درخت تھے مگر ان کا سایہ اتنا گہرا نہ تھا۔ اس جگہ پر درجن بھر پرانی قبریں تھیں گاؤں کے لوگ ان کو ''شہیدوں والی قبریں کہتے۔'' اکثر اس کے ذہن میں سوال ابھرتا کہ وہ شہید کون ہیں جو ان قبروں میں محوِ خواب ہیں۔ کب اور کیسے شہید ہوئے۔ اس سوال کا جواب کسی بڑے بوڑھے کے پاس بھی نہ تھا۔ بوڑھے بھی فقط یہ جواب دیتے کہ ہم نے بھی اپنے بچپن میں ان قبروں کے متعلق فقط یہی سنا تھا کہ یہ شہیدوں کی قبریں ہیں لیکن شہیدوں کے بارے کوئی نہیں جانتا۔

ان قبروں کے درمیان ایک ''ون'' کا درخت تھا جو اپنی شکل میں اپنے ہم قبیلہ درختوں سے الگ تھا۔ اس کا سایہ بھی زیادہ نہ تھا اور قد میں دوسرے سے کافی بلند۔ اس کی موٹی جڑیں زمین سے نکلی ہوئی تھیں اور دور سے ایسے دیکھائی دیتا جیسے کسی دیو مالائی گدھ نے اپنا خوفناک پنجہ گاڑ رکھا ہوں۔ اس مختصر سے قبرستان سے کوئی خوف نہ کھاتا۔ گرمیوں کی دوپہر میں کئی گھرانے اپنی چارپائیاں سروں پر اٹھائے ادھر آجاتے اور دوپہر ڈھلنے تک ستاتے۔ درختوں سے جھولے باندھ کر بچے کھیل میں مصروف رہتے۔ چند لوگ اپنی گائے اور بکریاں بھی ہمراہ لیتے آتے۔

اب اس قبرستان میں فقط دو درخت رہ گئے تھے۔ ایک وہ بلند جس کا تنا اختتام پر گدھ کے پنجے جیسا تھا اور ایک گول سایہ دار جو قبروں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ وہ بڑے غور سے درخت کے تنے اور زمین سے نکلی جڑوں کو دیکھ رہا اچانک اس کی نظر کچھ فاصلے بنی ایک نئی قبر پر پڑی۔ اس پر ایک سبز غلاف پڑا تھا جس کے چاروں کناروں پر اینٹیں دھری تھیں۔

گاؤں کی جانب سے ایک عمر رسیدہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ''شہیدوں والی قبروں'' کی سمت جا رہا تھا اور پھر وہ اُس غلاف والی قبر کے پاس ٹھہر گیا۔ کچھ دیر گم صم کھڑا رہا اور پھر اس کے سرہانے

کی جانب بیٹھ کر دُعا کی اور ہاتھ قبر پر رکھ کر نیم دراز ہو گیا۔ کافی دیر اُسی حالت میں رہا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ آنکھوں میں آئے آنسو قمیص کے دامن سے صاف کئے اور بوجھل قدموں سے واپس گاؤں کی جانب چل پڑا۔

فاصلہ ہونے کے باوجود اس نے بوڑھے کو پہچان لیا اور اسے معلوم ہو گیا کہ وہ قبر اس کے جواں سال بیٹے ''دلیر'' کی ہے۔ اس کو چند ہفتے قبل قتل کر دیا گیا تھا۔ دلیر کے واقعہ قتل کے وقت وہ ایک سرکاری کام کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ آج بعد دوپہر دلیر کے گھر جا کر اس کے والدین سے تعزیت کرے گا۔ وہ کافی دنوں بعد کل رات گاؤں آیا تھا۔

دلیر اس سے تقریباً دو سال چھوٹا تھا۔ بڑا محنتی، جفاکش اور نڈر۔ وہ بچپن میں اکٹھا کھیلا کرتے تھے۔ کھیل میں شریک بچوں میں وہ واحد تھا جو کھیلتے ہوئے اس سے جھگڑ بھی لیتا۔ جبکہ دوسرے بچے گھبرائے ہوئے اور سہمے رہتے۔ وہ ایک بڑے زمیندار گھرانے کا بچہ تھا اور گاؤں کے غریب بچوں کے ناپختہ ذہنوں میں جاگیردارانہ غلبے اور خوف کی چھاپ نقش ہوتی تھی۔

میٹرک کرنے کے بعد کالج کے زمانے میں جب وہ دسمبر کی چھٹیوں پر شہر سے گاؤں آتا تو دن کا بیشتر حصہ سور یا مرغابی کے شکار میں گزارتا۔ جو چند ملازم اس کے ساتھ مرغابی کے شکار پر جاتے ان میں دلیر بھی شامل ہوتا۔ ان کے گاؤں سے چند کلومیٹر دور شمال مغربی جانب اُن کے خاندان کی سینکڑوں ایکڑ اراضی سیم کی وجہ سے غیر آباد ہو کر جھیل نما تالابوں کی شکل اختیار کر گئی تھی اور سردیوں کے موسم میں ہزاروں کی تعداد میں مرغابیاں، مگ اور سرخاب وہاں آتے۔ ان کے خاندان کے چند لوگوں کے علاوہ وہاں کوئی شکار نہ کر سکتا تھا۔ ان جھیلوں کے ساتھ نسبتاً اونچی جگہوں پر کہیں کہیں کچے گھروں کے نشانات تھے جن میں کبھی ان کے مزارعین رہائش رکھا کرتے تھے۔

اس سیم زدہ زمین پر پہلے دو دیہات آباد ہوا کرتے تھے مگر اب سرکاری ریکارڈ میں ان کو ''بے چراغ'' لکھا جاتا ہے۔ یعنی اب جہاں کوئی چراغ نہیں جلتا۔ شکار کے دوران کئی دفعہ کئی کئی گھنٹے جھاڑیوں میں دبک کر مرغابیوں کے نزدیک آنے کا انتظار کرنا پڑتا۔ جھیل کے دوسرے کنارے

پر کچھ بلند جگہ پر چند گرے ہوئے کچے گھروں کی کچھ دیواریں سلامت تھیں اکثر اس کے ذہن سوال اٹھتا کہ یہ جگہیں کب بے چراغ ہوئی ہونگی، کس نے یہاں اپنے گھر میں آخری بار چراغ جلایا ہوگا۔ زمینوں میں سیم کا پانی آجانے پر لوگ کیسے یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے ہوں گے۔ کئی دفعہ سوچ آتی کہ اچھا ہوا یہ جگہ بے چراغ ہوگئی ورنہ اتنا اچھا مرغابی کا شکار کہاں کرتا۔ وہ اکثر گھوڑے پر سوار ادھر شکار کے لیے جاتا اور ہمراہ ملازم پیدل ہوتے۔ دلیر واحد ملازم تھا جو کبھی کبھی مذاحاً کہتا کہ ہم آپ کے نمک خوار ہیں ہمیں شکار ہوئی مرغابیاں انتہائی ٹھنڈے پانی سے اٹھانی پڑتی ہیں۔ ہمیں نمک کے علاوہ میٹھا بھی کھلا دیا کریں اور چائے اور کوئی حلوہ وغیرہ ہمراہ ہوا کرے کہ شکار کے بعد کھا سکیں۔

آپ کو اندازہ نہیں ٹھنڈے اور گیلے کپڑوں میں گاؤں تک ہمارا کیا حال ہوجاتا ہے۔"

شام کو وہ اپنے ایک ملازم کے ہمراہ دلیر کے گھر تعزیت کرنے گیا۔ دعا کے بعد دلیر کے والد سرور نے اسے کہا کہ اس کے ستائیس سالہ بیٹے کو بغیر کسی جرم و خطا معمولی سی تلخ کلامی پر ان کے ایک ملازم نے قتل کر ڈالا۔ اور پھر کثرت گریہ سے بات کو آگے نہ بڑھا سکا۔ کافی دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"جناب آپ چند دن گاؤں میں رہیں گے یا واپس شہر چلے جائیں گے۔"

"میں دو دن گاؤں ہی رہوں گا"

"میں کل صبح اپ کے پاس حاضر ہوں گا۔"

"ضرور آنا" اس نے سرور کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اگلے دن وہ اپنے مہمان خانے کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ سرور ایک تقریباً چار سالہ بچے کے ساتھ اسے گیٹ سے اندر آتا نظر آیا۔ بچہ انگلی پکڑے اچھلتا کودتا آ رہا تھا۔ نزدیک پہنچ کر جیسے ہی بچے کی نظر اس پر پری وہ سہم کر سرور کی ٹانگوں کے پیچھے چھپنے لگا۔

"ڈرو نہیں ان سے یہ ہمارے سردار ہیں"

''سرکار یہ میرا پوتا ہے۔ دلیر کا بڑا بیٹا''

''اچھا یہ دلیر کا بیٹا ہے؟ ادھر میرے پاس آ ؤ شاباش، ڈرو نہیں'' لیکن وہ بدستور دادا کی ٹانگوں سے لپٹا رہا۔ دادا اسے لیے اس کے قریب آ گیا اس نے بچے کے گال تھپتھپائے اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار کیا۔ سرور کرسی پر بیٹھ گیا اور بچہ اس کی گود میں دبک گیا۔ اس کے بچپن میں سرور جوان تھا چوڑا چکلا جسم، سانولا رنگ، گنجا سر اور چوڑی تراشیدہ مونچھیں۔ ڈیرے میں کھیلتے ہوئے اگر وہ کبھی زیادہ شور شرابا کرتا تو سرور پکڑ کر چٹکی کاٹ لیتا۔ اس سبب وہ واحد ملازم تھا جس سے وہ خوف کھاتا تھا۔

اس کے والد جب کبھی گاؤں سے باہر جاتے اکثر سرور ساتھ جایا کرتا۔

''جناب اب آپ بڑے آفیسر ہیں آپ آفیسر نہ بھی ہوں تب بھی ہمارے مائی باپ اور سردار ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ میرے بیٹے کو بنا کسی سبب معمولی تلخ کلامی پر قتل کر دیا گیا وہ بھی آپ کا ملازم اور وفادار تھا''

''مجھے دلیر کے قتل کا بہت دکھ ہے۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا''

''آپ کی عنایت ہے جو اسے دوست کہہ رہے ہیں ہم تو آپ کے نوکر اور نمک خوار ہیں۔''

''سرور ایسا مت کہو میں تو آپ کو اپنے خاندان کا حصہ سمجھتا ہوں کئی نسلوں سے تم لوگ ہمارے اوپر وفاداری اور محنت کا احسان چڑھا رہے ہو۔''

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے

''جناب میں آپ کے دادا کا ملازم رہا اور پھر آپ کے والد صاحب کا اگر چہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں مگر آپ کی نوکری سے انکاری نہیں۔ ہم پشتوں سے آپ کے تابعدار ہیں۔ آج میں کہنے آیا ہوں کہ میرے بیٹے کا قاتل گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ بھی آپ کا ملازم ہے ان کا خاندان بھی بہت مدت سے آپ کے خاندان سے وابستہ چلا آ رہا ہے۔ ہم ماچھیوں کے کل چار گھر ہیں آپ کے گاؤں میں اور قاتل کے خاندان والوں کے بیسیوں۔ میری یہ درخواست ہے کہ آپ کے

خاندان میں سے کوئی قاتل کی ناجائز امداد نہ کرے۔ آخر ہمارا بھی کوئی حق ہے آپ پر"

ساتھ ہی جھینپ کر خاموش ہو گیا۔ جیسے اپنا حق جتلا کر اس نے کوئی غلط بات کر دی ہو۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ سرور اپنا حق جتلا کر پریشان کیوں ہو گیا کیا اس نے کوئی غیر مناسب بات کہہ دی تھی۔ یا غربت آڑے آ رہی تھی۔ یہ غریبی بھی عجب مزاج ہے۔ اپنا حق بھی جتلانے نہیں دیتی اور اپنے حق اور احسان کو اتنا معمولی بنا کر پیش کرتی ہے کہ وہ احسان کے زمرے سے نکل کر معمول بن جاتا ہے اور معمول پر مہربانی کیسی۔ وہ اپنی سوچوں سے نکلا۔ اس نے سرور کو تسلی دی کہ اس کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی اور وہ اس کی جائز قانونی امداد بھی کرے گا۔

قاتل کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ سرور کا خاندان مزید دشمنی کے خوف سے گاؤں چھوڑ کر چلا گیا، چند سال بعد اسے معلوم ہوا کہ سرور کا انتقال ہو گیا ہے۔

کافی عرصہ بیت گیا۔ ایک دفعہ وہ گاؤں آیا ہوا تھا۔ چند ملازمین کے ساتھ اپنی فصلیں اور باغ دیکھنے گیا واپسی پر اس کی نظر "شہیدوں والی قبروں" پر گئی۔ دلیر کی قبر پرانی ہو چکی تھی۔ پاس سے گزارتے ہوئے اس نے گاڑی روکی۔ اور اس کی قبر کو دیکھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے دلیر اسے کہہ رہا ہے کہ اوائل جوانی میں تمھیں شکار کھیلاتے میں کتنے ٹھنڈے پانی سے مرغابیاں پکڑ کر لاتا تھا۔ تم گھوڑے پر سوار آتے، میں گیلے کپڑوں میں ٹھٹھرتا آتا۔ تمھارا نمک خوار رہا۔ اب میری قبر بے چراغ ہے۔ تم کم از کم فاتحہ تو پڑھتے جاؤ۔

وہ دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ ایک ملازم کا ہاتھ تھام کر ٹیلا چڑھا۔ فاتحہ پڑھی اور کافی دیر کھڑا رہا۔

میرے دوست دلیر تم لوگ نہیں، ہم نسل در نسل تمھارے نمک خوار ہیں۔ وہ نمک تو ہے ہی تمھاری محنت کے پسینے کا"

وہ تھکے قدموں سے ملازم کے کندھے پر ہاتھ رکھے ٹیلے سے نیچے اتر آیا۔

پتھر چہرے

قصبے کی بڑی مسجد کے ساتھ برگد کا ایک پرانا تناور اور گھنا درخت تھا۔ ایک بس روزانہ صبح نو بجے اسی درخت کے نیچے سے چلتی اور تقریباً شام پانچ بجے واپس آ جاتی۔ اس جگہ کی معاشی زندگی میں بس کا اہم کردار تھا۔ مقامی دکاندار شہر سے سامان خرید و فروخت اپنی دکانوں کے لیے اسی کے ذریعے لاتے۔ اس قصبے کے علاوہ اردگرد پھیلے اس پہاڑی علاقے میں کئی چھوٹے گاؤں آباد تھے۔ وہاں کے رہائشی بھی شہر جانے کے لیے اسی بس کو استعمال کرتے۔ صبح بس کی روانگی سے قبل برگد کے نیچے کافی چہل پہل ہوتی۔ درخت کے تنے سے ملحق ایک چھوٹا سا چائے کا کھوکھا تھا۔ جس کی جستی چھت کے اوپر برگد کی ایک شاخ آرام سے سوتی ہوئی محسوس ہوتی۔ جو مسافر پیدل دیہاتوں سے چل کر آ رہے ہوتے ان میں سے اکثر بس پر سوار ہونے سے پہلے اس کھوکھے سے چائے پیتے۔

بس کا ڈرائیور وزیر پچھلے پندرہ سال سے بس چلا رہا تھا۔ روانگی سے تقریباً پانچ منٹ قبل وہ انجن اسٹارٹ کر دیتا۔ ایسے میں برگد کے نیچے چائے بنانے کے لیے جلائی گئی آگ کے دھوئیں کے ساتھ انجن کا کثیف دھواں بھی شامل ہو جاتا۔ وزیر ڈرائیور بس اسٹارٹ کرنے کے بعد نیچے اترتا اور سواریوں کو بس میں بیٹھنے کے لیے کہتا۔ بس کے انجن کی گرگر کی آواز اتار چڑھاؤ کا شکار ہوتی اور ایسا لگتا کہ بس چلنے سے قبل ہی تھکاوٹ سے ہانپ رہی ہے۔ بس کانپنے کی وجہ سے سیٹوں کے پیچھے لگے گول لوہے کے ایش ٹرے اور چھت پر فریم میں لگی تصاویر لرزنے لگتیں اور ان کی آواز انجن کے شور سے ہم آہنگ ہو جاتی۔

یہ قصبہ ایک ٹیلے پر آباد تھا۔ اس کی بلندی زیادہ نہ تھی۔ گرداگرد ڈھلوان دار کھیت دور دور

تک پھیلے تھے جن کے درمیان چند سرسبز پہاڑیاں تھیں اور پھر مشرق اور شمال کی سمت بلند پہاڑ تھے۔ کچھ لوگ اس قصبے کو گاؤں کہتے ان کا خیال تھا کہ آبادی اور مکانیت اس جگہ کی اتنی نہیں ہے کہ اسے قصبہ گردانا جائے اور اسے قصبہ ماننے والوں کی دلیل یہ تھی کہ کئی کلومیٹر اردگرد موجود چھوٹے دیہات اسی قصبے کے بازار سے خرید وفروخت کرتے ہیں اور اس جگہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس لیے یہ قصبہ ہے۔ چند نوجوان اسے دور افتادہ اور پسماندہ گاؤں مانتے کیونکہ یہاں اُن کے لیے محنت مزدوری اور دوسرے ذرائع آمدنی بہت محدود تھے۔ امنگوں اور امیدوں کے تانے بانے بنتے ہی الجھاؤ کا شکار ہوجاتے۔ اس جگہ کے بیشتر نوجوان کام کاج کی عمر کو پہنچتے ہی روزگار کی تلاش میں بڑے شہروں کو نکل جاتے اور کبھی کبھار ہی چھٹی پر واپس آتے۔

اس قصبے کا مختصر سا بازار، ڈاک بنگلے کے قریب واقع تھا۔ اب وہ ڈاک بنگلہ زیادہ آباد نہ رہا تھا۔ اگرچہ اس میں ایک باورچی اور دو چوکیدار کام کرتے اور ان کے خاندان اسی عمارت کے وسیع احاطہ میں بنے سرونٹ کوارٹرز میں ہی مقیم تھے۔ مگر اب اس جگہ کی نگہداشت اور رنگ وروغن پر حکومت کی توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ سرکاری ملازم بھی اب شاذ ونادر ہی کوئی ادھر قیام کرتا۔ اس کی چاردیواری بھی چند جگہوں سے گر گئی تھی۔

بازار میں درجن بھر دکانیں تھیں۔ ایک جیسی شکل وصورت اور حلیہ، چھوٹے تراشیدہ پتھروں سے بنی اور پرانے لکڑی کے موٹے دروازے۔ اشیاء فروخت بھی تقریباً سب میں ایک جیسی، گندم، جو، دھان بھی اکثر دکاندار خرید لیتے۔ غریب دیہاتی تھوڑا بہت اناج بیچ کر سبزی اور گھی، چینی گڑ وغیرہ خرید کرتے۔ سب سے پرانی اور بڑی دکان منظور پاؤلی کی تھی۔ نیم تاریک اس دکان کے سامنے بنے برآمدے میں بھی، چینی، شکر، گڑ، دالوں اور ثابت مرچوں کی بوریاں کھلے منہ پڑی ہوتیں۔ چند سال قبل منظور کے ایک رشتہ دار نے ساتھ ایک کپڑے کی دکان بنالی۔ جس سے نہ صرف بازار کی رونق میں اضافہ ہوگیا بلکہ دکان کے سامنے رنگ برنگے پھولدار کپڑے لٹکانے کے سبب گلی میں خوبصورتی آ گئی۔ اس بازار میں سب سے پہلا بورڈ دکان کے ماتھے پر اس نے لگوایا اور اسے دیکھ کر منظور پاولی

کے بیٹے نے اپنی دکان کے سامنے اس سے بھی بڑا اور زیادہ رنگدار بورڈ لگوایا۔

''میاں منظور کریانہ اینڈ جنرل سٹور''

ڈاک بنگلے سے کچھ فاصلے پر یہاں کی بڑی سڑک پر ایک چھوٹا سا ہسپتال قائم تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہاں تعینات ڈاکٹر شہر سے فقط چند دفعہ ہی آیا باقی وہاں کا کل انتظام اور آئے مریضوں کا علاج معالجہ ڈسپنسر کرتا۔ وہ اپنے آپ کو کوالیفائیڈ ڈاکٹروں سے زیادہ قابل اور تجربہ کار گردانتا اور علاقے کے لوگ بھی اس کے ہاتھ میں شفا ہونے کے قائل تھے۔ یہاں کے اور اردگرد دیہات کے لوگ اپنے علاوہ اپنے مال مویشیوں کا علاج بھی اسی سے کرواتے۔

خلیجی اور چند یورپی ممالک سے کئی لوگ اپنی جوانیاں محنت مشقت کی نذر کرنے کے بعد بڑھاپا سکون سے گزارنے واپس اس قصبے میں آ گئے تھے۔ وہ اس جگہ کو ساری دنیا پر ترجیح دیتے۔ وہ اپنے علاقے کو سکون اور امن و امان کا جزیرہ مانتے جو ظلمت اور لاقانونیت کے بے کراں سمندر میں قائم ہے۔

وزیر ڈرائیور پرسوں جب شہر سے واپس آیا۔ اور بس کو برگد کے نیچے کھڑا کرنے کے بعد گھر لوٹا تو اس کے ہاتھ میں بڑا سا پلاسٹک کا لفافہ تھا جس میں مختلف اشیاء تھیں، جو وہ اپنی بیوی کے لیے شہر سے لایا تھا۔ اس کی شادی ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ اس کے سسرال والے اس شہر رہتے جہاں وہ روزانہ بس لے کر جاتا تھا اور وہ اس کے دور کے رشتہ دار تھے وہ چونکہ اکیلا تھا۔ ماں باپ، بہن بھائی کوئی زندہ نہ تھا۔ اس لیے شادی سے پہلے اور بعد میں بھی سسرال والے کئی بار تقاضا کر چکے تھے کہ وہ قصبے سے اپنا چھوٹا سا گھر بیچ کر شہر منتقل ہو جائے لیکن وہ نہ مانا۔ اسے اس جگہ سے بہت انس اور پیار تھا۔ اس کے ذہن میں وطن کا تصور اس قصبے سے وابستہ تھا۔ اسے یہاں کے لوگوں سے پیار تھا سب اس کی عزت کرتے تھے اسے اپنی بیوی سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ کسی رشتہ دار کے دنیا میں نہ ہونے سے جس تنہائی کا وہ شکار تھا اس سے اب وہ نجات پا چکا تھا۔ کبھی کبھی اسے اپنی بیوی کے رویے اور نگاہوں سے بیگانگی کا تاثر ملتا لیکن اس کی محبت اور

وابستگی اس طرف توجہ جانے نہ دیتی۔ شادی کے بعد اس کی سوچ اپنی بیوی اور بس سے ہٹ کر کبھی کہیں گئی ہی نہ تھی۔

گھر پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ وہ بڑا حیران ہوا جب دروازے کو اندر سے کھلا پایا۔ گھر میں داخل ہو کر وہ دونوں کمروں میں گیا۔ اس کی بیوی موجود نہ تھی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ کچھ دیر کے لیے بستر پر دراز ہو گیا کہ بیوی کسی ہمسایہ کے گھر گئی ہو گی۔ شام گہری ہو گئی۔ پھر رات ہوئے کچھ دیر ہو گئی، اس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ وہ بستر سے اٹھا اور چلتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا۔ کچھ سوچ کر اس نے کپڑے رکھنے والی الماری کھولی۔ اس کی بیوی کے اکثر کپڑے غائب تھے۔ اس کا دل رک کر پھر تیز تیز چلنے لگا۔ واہمے منڈلانے لگے۔ وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکا ہمسایوں کے گھر گیا مگر بیوی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ اگلے دن وہ سسرال والوں کے گھر گیا۔ سسرال والے پریشان ہوئے لیکن نجانے کیوں انہوں نے معاملہ کو زیادہ کریدا نہیں۔ جس کے سبب اس کے شکوک وشبہات میں اضافہ ہو گیا۔

شام کو جب وہ نڈھال اپنے گھر پہنچا۔ اس کی ہمسائی آ گئی اس نے جھجکتے ہوئے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اس کی بیوی اپنے آشنا کے ساتھ گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم'' اس نے غصے سے کہا۔ مگر اس کے لہجے میں غصے سے زیادہ خفت پنہاں تھی۔

''میں نے ایک نوجوان کو کئی مرتبہ تمھارے گھر آتے جاتے دیکھا تھا جو ہمارے قصبے کا نہیں تھا'' وہ چند لمحے کو خاموش ہوئی اور پھر دوبارہ بولی۔ ''تمھاری بیوی کو میں چند دفعہ دبے الفاظ میں سمجھایا بھی، تم سے بات کرنے کا کئی مرتبہ سوچا لیکن تمھاری اس سے محبت اور پیار دیکھ کر مجھے ہمت نہ ہوئی''

اس کی ہمسائی باتیں کرتی رہی لیکن اسے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا وہ مسلسل اپنے گرد آلود جوتوں پر نگاہیں گاڑے بیٹھا رہا۔ اسے کوئی خبر نہ ہوئی کہ وہ کب اٹھ کر چلی گئی۔ معطل سوچ

ہراساں دل سے وہ کھڑا ہوااور گھر سے باہر نکل آیا۔

ماحول پر چاندنی کی حکمرانی تھی، قصبہ سکون کی چادر اوڑھے تھا۔ دور کسی کتے کے بھونکنے سے خاموشی ٹوٹتی یا کسی گھر میں گائے، بھینس کے گلے میں بندھی گھنٹی بج اٹھتی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا برگد کے درخت کے قریب چلا آیا۔ نیچے کھڑی بس کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ اس نے دروازے کے ساتھ لٹکتے چھوٹے سے تالے کو کھولا بس کے اندر داخل ہو کر ایک سیٹ پر بیٹھ کر سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور زار و قطار رونے لگا۔

''اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تم تو جانتی ہو مجھے اس سے کتنی محبت تھی۔ تم سے بھی زیادہ پیار میں نے اس سے کیا، حالانکہ میرا اور تمھارا ساتھ پندرہ سال پرانا ہے۔ مجھے ماں باپ، بہن بھائی کسی کی محبت نہیں ملی۔ سب مجھے تنہا چھوڑ کر اس وقت چلے گئے جب میں محبت اور پیار کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی عمر کو بھی نہ پہنچا تھا۔ میں نے اسے اتنا چاہا کہ کبھی یہ سوچنے کی کوشش بھی نہ کی کہ وہ بھی مجھے پیار کرتی ہے یا نہیں۔ میں اب کیا کروں۔ کون ہے میرا دکھ بانٹنے والا، تمھارے علاوہ کس سے اپنا درد بیان کروں، اس نے سیٹ پر زور سے ہاتھ مارا جیسے بس سب کچھ سن رہی ہو۔''

''تم ہی بتاؤ اگر تم شہر سے واپس اندھیری رات میں اس پہاڑی بل کھاتی سڑک پر بھاگتی آ رہی ہو اور اچانک تمھاری بتیاں گل ہو جائیں، تو کیا تم چل سکو گی۔ اس برگد کے نیچے پہنچ پاؤ گی؟ کبھی نہیں۔ اسی طرح میری زندگی کی روشنی چھن گئی ہے۔ اب میں تم سے بھی دور چلا جاؤں گا۔ قصبے میں بھی نہیں رہوں گا۔ مجھ میں ہمت نہیں کہ لوگوں کی ملامت بھری نظروں کا مقابلہ کر سکوں۔ تمہیں چلاؤں گا تو لوگ مجھ سے میری بیوی کی بے وفائی سے متعلق سوال کریں گے۔ ایسی تذلیل کیا میں برداشت کر سکوں گا؟ نگاہوں میں چھپے بے زبان سوال میرے زخموں کو اور گہرا نہ کریں گے؟ میں طنز اور ملامت کے ہاتھوں ہلاک ہونا نہیں چاہتا۔'' وہ بس سے نکلا اور آنکھوں پر لرزتے آنسو پونچھتا گھر لوٹ گیا۔

بس کا مالک شہر میں رہتا تھا۔ سونے سے قبل وزیر نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کل بس کو شہر لے جائے

گا اور واپس بھی لائے گا پھر اس ملازمت کو چھوڑ دے گا۔ کل شہر بس مالک کے گھر جا کر اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دے گا۔

اگلی صبح اس نے حسب معمول بس کو صاف کیا۔ اسٹارٹ کرنے کے بعد سواریوں کو بس میں بیٹھنے کا کہا۔ ارد گرد علاقے میں اکثر لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ وزیر ڈرائیور کی بیوی اسے چھوڑ کر آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔

اس نے کسی سے بات نہ کی دو بوڑھی عورتوں نے اس سے افسوس کیا اور اس کی بیوی کو برا بھلا کہا وہ کچھ نہ بولا۔

ہر نگاہ اسے اپنے اندر تک اترتی محسوس ہوئی۔ لگا جیسے برگد کے پتے بھی اسے دیکھ کر طنزاً مسکرا رہے ہوں۔

شہر میں بس مالک نے اسے نوکری چھوڑنے سے بہت روکا تنخواہ زیادہ کرنے کا لالچ دیا لیکن وہ کسی طور نہ مانا۔

اس نے اپنے متبادل کے طور پر اپنے بچپن کے دوست اسلم کا نام تجویز کیا جسے بس کے مالک نے مان لیا۔

شام کو بس بند کر کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں کئی واقف کاروں نے از راہ ہمدردی اس کی بیوی کی گمشدگی پر تشویش کا اظہار کیا۔ ہر لفظ پگھلا سیسہ بن کر اس کے کانوں میں اترا۔ وہ نظریں جھکائے اپنے دوست اسلم کے گھر چلا آیا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ اسلم صحن میں بندھی بکریوں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ اس کے اترے چہرے کو دیکھ کر چارہ ہاتھ سے پھینک کر اس کے پاس چلا آیا۔

''خدا تمہیں خیر سے رکھے۔ تمھاری آنکھیں سرخ اور یوں بوجھل ہیں جیسے تم کئی دنوں سے سوئے نہیں۔'' اسلم نے اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یار میری تو قسمت سو گئی ہے۔ میرے مقدر آنکھیں بند کر گئے اور عزت دفن ہو گئی۔ میں

تباہ ہو گیا، جو مجھ پر گزرا اس بات کی کبھی مجھے سوچ بھی نہیں آئی تھی۔"

"میں جب میٹرک کر رہا تھا ہمارے اسکول کی چار دیواری کے ساتھ کافی درخت تھے۔ ایک بڑا طوفان آیا۔ صبح جب میں اسکول آیا تو ایک سرسبز تناور درخت جڑ سے اکھڑ کر پڑا تھا۔ باقی تمام درخت بدستور کھڑے ہلکی چلتی ہوا میں لہلہا رہے تھے۔ مجھے بڑا ترس آیا اس بے چارے درخت پر، بہت دن اس کے یوں مٹ جانے کا صدمہ مجھے رہا۔" میرے ساتھ بالکل اسی درخت کی طرح ہوا"

"کسی نے رات کو مجھے بتایا تھا" اسلم نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

اور کچھ دیر تاسف سے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ "کیا یہ بات سچ ہے"

"کون سی بات۔ میری بیوی والی؟ ہاں تم نے ٹھیک سنا ہے"

"یار مجھے دلی رنج ہوا ہے۔ سمجھ نہیں آتی تمہیں کیسے حوصلہ دوں"

"مجھے کوئی حوصلہ نہ دو۔ جو قسمت میں لکھا تھا، اور ویسے بھی سوائے حوصلے کے میں کر بھی کیا سکتا ہوں"

وہ دونوں چپ ہو گئے۔ بکریوں کے چارہ کھانے کی چرر چرر کی آواز تھی اور ان دو میمنوں کے صحن میں اِدھر اُدھر بھاگنے کی۔

"کل تم بس چلا کر شہر لے جانا۔ اب سے تم اس کے ڈرائیور ہو۔ میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔"

اس نے چابی جیب سے نکال کر اسلم کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا اور تم ایسا کر بھی کس طرح سکتے ہو۔ تمہیں تو بس چلانے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔"

اس نے چابی اسے واپس پکڑاتے ہوئے کہا۔

"میرے بھائی ہر شوق اور جنون کا آخر ہوتا ہے اور میرے اس جنون کا بھی آج آخری دن

ہے۔تم تو جانتے ہو کہ میری بیوی کا مجھے چھوڑ جانا اور میرا بس کو چھوڑ دینا۔ یہ دونوں باتیں میرے لیے کتنی اذیت ناک ہیں لیکن میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔ میں نے بس مالک سے تمھاری ملازمت کی بات طے کرلی ہے اور مجھے معلوم ہے تمہیں بھی بس چلانے کا بڑا شوق ہے۔تم بس چلاؤ گے تو مجھے محسوس ہوگا کہ وہ پرائے ہاتھ میں نہیں گئی۔'' چابی دوبارہ اسلم کو پکڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ چند منٹ قبل وہ اپنے لیے ایک کپ چائے بنا کر اور ساتھ بسکٹ پلیٹ میں ڈال کر بیٹھا تھا جو وہ پرسوں اپنی بیوی کے لیے لایا تھا۔ ایک بسکٹ اور آدھا کپ چائے پی تھی کہ اسے بس کی آواز سنائی دی۔ برگد کے نیچے سے چل کر وہ اس کے چھوٹے سے گھر کے سامنے سے گزر کر شہر جاتی تھی۔ اس نے ایک بڑا سا گھونٹ چائے کا بھرا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر اُس کی اوٹ سے گزرتی بس کو دیکھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کا جسم بے جان ہو رہا ہے اور اس کی روح جسم سے نکل کر بس کے پیچھے بھاگی جا رہی ہے۔ شام کے وقت بستر پر ہی پڑا تھا جب اسلم نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تقریباً سارا دن وہ بستر سے نہیں نکلا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اسلم کو لیے صحن میں آ گیا۔ برآمدے سے وہ دو کرسیاں گھسیٹتا ہوا صحن میں لے آیا۔ اسلم شہر سے اس کے لیے کچھ کنوں اور سبزیاں لایا تھا۔ پھر اس نے بس مالک سے اپنی بات چیت سے اسے آگاہ کیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کیں۔ بس کے متعلق گفتگو کی۔ ''آج بڑا شغل ہوا وہ اچانک یاد آنے پر چہک کر بولا''

''کیا بات ہوگئی''

''آج بڑی مسجد کے مولوی عبدالرحمان اور حاجی غفار صاحب میں جھگڑا ہوگیا۔

تم جانتے ہوناں حاجی غفار کو، وہ حاجی غفار ڈنمارکی۔ جو ساری عمر ڈنمارک میں رہ کر اب واپس آ گئے ہیں بڑے ہمدرد، غریب پرور اور اچھے آدمی ہیں''۔

''ہاں یار! حاجی صاحب کو سارا علاقہ جانتا ہے لیکن جھگڑا کیوں اور کس بات پر ہوا''

''آج دونوں شہر گئے اور واپس بھی میرے ساتھ ہی آئے۔ بیٹھے بھی میرے پیچھے ساتھ ہی

تھے۔ ہوا یہ کہ بس شہر سے روانہ ہونے والی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا ہمارے قصبے کا بس میں سوار ہوا اور ''السلامُ وعلیکم'' کہتا ہوا۔ مولوی صاحب کے پاس سے گزرا۔ مولوی صاحب نے اسے واپس بلایا اور ڈانٹ کر کہا برخوردار سلام کرنے کی تمیز سیکھو۔ وہ لڑکا بے چارہ پریشان ہو گیا اور اس نے سوال کیا کہ اس سے کیا غلطی ہوئی ہے۔''

''اچھا تمھیں غلطی بھی اب بتاؤں۔ بدتمیز انسان بڑوں کو سلام تمیز سے کرتے ہیں۔ میں کوئی تمھارا دوست یا ہم عمر ہوں جو السلامُ وعلیکم کہہ کر گزر گئے۔ ساتھ، جناب یا مولانا کا لفظ لگانا سیکھو۔ کیا یہی بدتمیزی تمھیں سکھائی جاتی ہے۔''

وہ لڑکا تو معذرت کر کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا، لیکن حاجی غفار صاحب اور مولوی عبدالرحمن میں بحث چل نکلی۔

حاجی غفار نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ مجھے آپ بتائیں کہ آپ کا پورا نام کیا ہے۔

مولوی صاحب چند لمحوں کے لیے حیران ہوئے اور پھر کہا ''میرا نام ہے مولانا عبدالرحمٰن جامی''

''کیا مولانا آپ کے نام کا حصہ ہے۔''

''نام کا حصہ تو نہیں۔ میں الحمدللہ عالم دین ہوں، پابند شریعت ہوں، اس لیے ہم لوگ نام کے ساتھ مولانا کہلواتے اور لکھتے ہیں۔''

''بہت اچھا! عبدالرحمن صاحب آپ عالمِ دین ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مولانا کا کیا مطلب ہے۔ اس کا مطلب ہے (مولانا) یعنی میرا مولا۔ میرا آقا و سردار۔ کیا کوئی شخص اپنا تعارف کرواتے ہوئے دوسرے کو کہہ سکتا ہے ''میرا مولا عبدالرحمان''

عبدالرحمٰن صاحب کچھ پریشان ہوئے۔

"اب آپ اس بچے پر فقط اس لیے برسے کہ اس نے آپ کو ''حضرت مولانا السلامُ وعلیکم'' کیوں نہیں کہا۔"

''غفار صاحب آپ ساری عمر کافروں کے ملک میں رہے ہیں۔اس لیے اس عمر کو پہنچ کر بھی دین کو نہیں سمجھے۔''

آپ دور کی بات چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ آپ چند جماعتیں پڑھے ہوئے کیسے اپنے آپ کو ہمارے مولا سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔اور اپنا تعارف خود کروا رہے ہوتے ہیں۔مولانا فلاں اور مولانا فلاں۔کمال ہو گئی ہماری سمجھ بوجھ کی بھی۔کہ کوئی اپنے آپ کو عالم سمجھنے والا انسان اپنا تعارف کرواتا ہے۔''میرا مولا عبدالرحمن'' یا مولانا عبدالرحمن ''عبدالرحمن صاحب کیا نا کا مطلب عربی میں میرا ہے کہ نہیں''

مولوی عبدالرحمٰن کچھ نہ بولے۔

یار مجھے ایک کپ چائے پلاؤ پھر باقی قصہ سناؤں گا۔کچھ دیر بعد وزیر دو کپ چائے اور بسکٹ ایک پلیٹ میں ڈال کر لے آیا۔اس کی باتیں سن کر وزیر کی طبیعت کچھ سنبھلی اور اس کی توجہ بٹ گئی۔

''پھر حاجی غفار نے اسے کہا کہ جس سے آپ ناراض ہوں وہ دائرہ اسلام سے خارج یعنی اسلام کو لوگوں نے ذاتی جاگیر سمجھ لیا ہے۔جس نے آپ کو حضرت مولانا صاحب کہہ کر نا پکارا وہ کافر۔جس نے آپ کے قدموں کو نہ ہاتھ لگایا اس کا نکاح ٹوٹ گیا۔''

''الحمد اللہ میں نے کسی امام مسجد کو کبھی مولانا یا مولوی بھی نہیں کہا۔مولوی اس لیے نہیں کہا کہ وہ بھی بہت بڑا القب اور خطاب ہے۔جیسے لاہور کے رہنے والا لاہوری۔قصور والا قصوری، گجرات والا گجراتی ایسے ہی مولا والا مولوی۔کیا ہر داڑھی اور نماز پڑھانے والا ''مولا والا ہے'' قطعاً نہیں''

''میں حیران بیٹھا بس چلا رہا تھا کہ مولوی صاحب آج اتنی باتیں کیسے سنتے آ رہے ہیں اور ابھی تک حاجی غفار کو کافر کیوں نہیں قرار دے رہے۔''

''جنہیں دین کی سمجھ بوجھ نہیں ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی عذاب الٰہی کا سبب ہوتا ہے۔''

اور مولوی صاحب غصے اور ناراضگی سے اٹھ کر بس کے پچھلے حصے میں چلے گئے۔

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اسلم نے اس سے پوچھا کہ آیا اس نے بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ

پولیس میں کروائی کہ نہیں۔ اس کے والدین کو بھی معلوم ہے وہ کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔'' میں پولیس میں رپورٹ کروا کر مزید کالک اپنے منہ پر نہیں لگانا چاہتا کوئی اور بات کرو''

اگلے دن وزیر قصبے سے باہر نکل کر سرسبز پہاڑیوں کی طرف چل پڑا دو پہاڑیوں کے درمیان ایک عمودی چٹان پر تین مجسمے بنے ہوئے تھے۔

ان کے سامنے ایک قدیم چبوترہ تھا جس کے ایک جانب چند گھنے درخت موجود تھے۔ وہ چند سیڑھیاں طے کرتا چبوترے پر آیا ان بتوں کے سامنے کھڑے ہو کر انہیں غور سے دیکھتا رہا، اور پھر درختوں کے نیچے پڑے ایک بڑے سے گول پتھر پر بیٹھ گیا۔ اپنے بچپن میں دوستوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ بہت دفعہ ادھر آیا تھا، لیکن ان پر اس نے کبھی توجہ نہ دی تھی۔ وہ قد آدم مجسمے آج اسے اپنے ہمدرد اور مونس لگے۔

سکون سے کھڑے انہوں نے صدیوں کو اپنے سامنے سے آہستہ آہستہ گزرتے دیکھا۔ شاید یہاں کبھی کوئی مندر ہو گا جسے وقت کی آندھی اپنے ساتھ ہوا کر گئی۔ اس نے ان بتوں پر نگاہ مرکوز کیے سوچا۔ اس نے سارا دن وہیں گزارا۔ شام گہری ہو گئی تو وہ وہاں سے اٹھا اور بوجھل قدموں سے واپس چل پڑا۔

چند واقف کار اسے راستے میں ملے۔ انہوں نے اس سے بات کرنی چاہی لیکن وہ کسی سے نگاہ ملائے بنا سر جھکائے چلتا رہا۔

بھوک نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ آگ جلا کر اس نے چائے بنائی اور ساتھ بچے ہوئے بسکٹ کھائے جنہیں وہ چند دن پہلے شہر سے لایا تھا۔ اگلے کئی دن یہ اس کا معمول رہا۔

وہ ناشتہ کر کے نکل جاتا اور شام کو وہاں سے واپس آتا۔ اس چٹان کے پاس ہی ایک چشمہ تھا۔ پانی بہنے کی آواز اور ہوا کی درختوں سے سرگوشیاں باہم سنائی دیتیں۔ کبھی سرگوشیاں تیز ہو جاتیں اور کبھی پانی کی گنگناہٹ غالب آ جاتی۔ اکتاہٹ دور کرنے کے لیے وہ گھنٹوں بیٹھا مجسموں سے باتیں کرتا رہتا۔ سوال تراشتا اور کچھ سوچ کر جواب بھی انہیں دیتا۔

''تم اپنا گھر بار چھوڑ کر ہمارے پاس ہی کیوں نہیں آ جاتے۔ایسے انسانوں کے درمیان کیا رہنا جن سے تم منہ چھپاتے پھرتے ہو۔کون ہے وہاں تمھارا۔''

ایک دن اس نے ان کی طرف سے سوال اور دعوت دی

''میں کل آپ کو سوچ کر جواب دونگا۔لیکن میرے ادھر آنے سے آپ کے سکون اور تنہائی پر فرق نہیں پڑے گا''۔

''ہمیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ہم ہر حال میں نباہ کر لیتے ہیں۔''

''لوگ کبھی ہمیں خدا مان کر پوجتے ہیں اور کبھی ناپاک جانتے ہوئے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ ہمیں دونوں حالتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

رات اس نے فیصلہ کیا کہ اپنا گھر بیچ دے گا اور ان مجسموں کے پاس کٹیا بنا کر رہنے لگے گا۔

اگلے دن جب اسلم بس کو کھڑا کرنے کے بعد اسے ملنے آیا تو اس نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

''یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔اور تم اکیلے اس جگہ پر کیسے رہو گے۔میں تمھارے جذبات سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی تمہیں ایسا کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔''

مگر وہ اپنے فیصلے پر جما رہا۔اونے پونے گھر کو بیچا۔پیسے بنک میں جمع کروائے اور مجسموں کے قریب اس چبوترے پر درخت کے نیچے اس نے ترپال، بانسوں اور درختوں کی شاخوں سے ایک کٹیا بنا لی۔کچھ ضروری سامان لیا اور ادھر منتقل ہو گیا۔کبھی کبھی کچھ خریداری کرنے قصبے چلا جاتا۔دو تین دن کے وقفے کے بعد اسلم کچھ دیر کے لیے اسے ملنے چلا آتا۔''

وہ ماحول سے جلد ہی آشنا ہو گیا۔تنہائی اور خاموشی کی مٹھاس بڑھنے لگی کبھی کبھار وہ دوران گفتگو مجسموں سے اپنی بیوی کا شکوہ کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا۔

''کیا تمہیں اکیلے پن سے وحشت نہیں ہوتی۔اسلم نے ایک دن اس سے پوچھا۔

میں اکیلا نہیں رہتا۔یہ مجسمے میرے ہم سایہ اور ساتھی ہیں۔انہوں نے مجھے کبھی اکیلے پن کا

احساس نہیں ہونے دیا۔ دیکھو کتنے معصوم ہیں یہ، پہلے روز جب غور سے میں نے انہیں دیکھا تو عجب انکشاف ہوا، اور میں بہت دیر انہیں تکتا رہا۔ وہ حیران کن بات تھی میرے لیے کہ ان کے چہرے پتھریلے ہیں مگر پتھرائے ہوئے نہیں ہیں۔ ان میں کئی پیغام پنہاں ہیں۔ محبت اور ہمدردی کا پیغام، پیار ان پتھریلے خدوخال سے امڈتا ہے۔ انسانوں کی طرح حسد، بغض وعناد ان میں نہیں۔ مجھے ان سے انسیت ہوگئی ہے۔ میں گھنٹوں ان کو دیکھتے ہوئے ان سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔"

"ادھر دیکھو ایک دور خلاؤں میں گھور رہا ہے۔ دوسرا وادی کے کنارے کو تک رہا ہے اور تیسرا ایسے لگ رہا ہے جیسے ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا ہو۔ غور سے دیکھو ان کی آنکھیں جامد ہیں، منجمد ہیں، مگر سرد نہیں۔ گرم جوشی اور شفقت ہے ان کی انکھوں میں۔ مجھے سرد نگاہوں سے خوف آتا ہے وہ انسان کے اندر سرایت کر کے تذلیل کا زہر پھیلا دیتی ہیں۔

اسے ادھر آئے تقریباً چھ ماہ ہونے کو آئے۔ اسلم کے علاوہ ادھر سے گزرتا کوئی واقف کار بھی اسے ملنے چلا آتا۔ آہستہ آہستہ اس کے متعلق چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک دن اسلم اسے ملنے آیا وہ کافی پریشان اور متفکر دکھائی دے رہا تھا۔"

"کل قصبے کی بڑی مسجد کے مولوی نے خطبہ جمعہ میں تمہیں بہت برا بھلا کہا"

"میں نے کیا بگاڑا ہے اس کا"

"وہ کہہ رہا تھا تم اسلام چھوڑ کر بت پرست ہو گئے ہو اور جو تم سے تعلق رکھے گا اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا"

"یا اللہ ہم سب پر اپنا رحم اور کرم فرما۔۔۔ لیکن میں نے تو خود ہی سب سے اپنا تعلق توڑ لیا ہے۔ اور تم شادی شدہ ہو نہیں اس لیے تمہیں گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے اسلم سے کہا۔ لیکن وہ بدستور سنجیدہ اور متفکر تھا۔ اگرچہ اسلم فقط میٹرک تک پڑھا ہوا تھا مگر بہت سمجھدار انسان تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ انسان کا مذہبی جوش منفی سمت میں کتنا جلد اور آسانی سے ابھارا جا سکتا ہے۔

''دوست''، تم کوئی مشورہ دو میں اس صورتحال میں کیا کروں؟" اس نے اس مجسمے کو مخاطب کیا جس کی آنکھیں ان پر مرکوز تھیں۔ اسلم کو معلوم تھا کہ اس نے ان مجسموں کے نام رکھے ہوئے ہیں۔ دائیں ہاتھ والا مجسمہ جو آسمان کو دیکھ رہا تھا اسے وہ "بڑا بھائی" پکارتا تھا۔ ساتھ والے کا نام "چھوٹا بھائی" تھا اور بائیں طرف والا جو اپنے سامنے انسان کو غور سے دیکھتا محسوس ہوتا اسے وہ ''دوست'' کہتا تھا۔

چند دن بعد اسلم پھر آیا۔ آج وہ بہت ہراساں تھا۔ اسے مشورہ دیا کہ وہ یہ جگہ چھوڑ کر فوراً کہیں اور چلا جائے اور قصبے کا رخ بھی نہ کرے۔ اس نے بتایا کہ لوگ اس سے بہت بدگمان ہو گئے ہیں ان کو مولوی نے اس حد تک قائل کر لیا ہے کہ اگر وہ بدستور ادھر رہتا ہے تو خدا قصبے والوں سے ناراض ہو کر کوئی عذاب بھی بھیج سکتا ہے۔ اور ایک ملحد کی ہمسائیگی کی وجہ سے ان کے نیکی لکھنے والے رجسٹر فرشتوں نے بند کر دیئے ہیں۔

''کیا وہ فرشتے اس مولوی صاحب سے پوچھ کر رجسٹر کھولتے اور بند کرتے ہیں؟''

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں"

"کیا مولوی صاحب تک مالک کائنات کا یہ پیغام نہیں پہنچا کہ جس نے ایک بے گناہ انسان کو قتل کیا اس نے گویا ساری انسانیت کو ہلاک کر ڈالا۔ مجھے واجب القتل قرار دینا کہاں کی شرافت اور کون سا دین ہے۔ میرے نزدیک یہ مجسمے فقط تراشے ہوئے پتھر ہیں میں تو فقط انسانوں کے ظلم اور چبھتی نگاہوں سے بچ کر یہاں آ گیا ہوں۔ میں کیونکر خارج از اسلام ہو گیا۔ کیا اسلام کو انہوں نے اپنی جاگیر بنا رکھا ہے۔ اللہ کے گھروں پر قبضے کے بعد کیا یہ اس کے دین پر قابض ہو گئے ہیں؟''

''میں کیا کہوں۔ لیکن تم ادھر نہ رہو تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

"مالک میری حفاظت کرے گا اسے معلوم ہے میں کیا کر رہا ہوں۔"

''یار تمہیں معلوم ہے وہ مولوی کیسا انسان ہے اور اس کی ذہنیت کا بھی اندازہ ہے وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کئے رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک امن کا مفہوم فقط ذاتی سکون ہے۔''

اُس بات کو کافی دن گزر گئے۔ اس کے دل سے خوف کے سائے کچھ ہٹ گئے۔ نومبر کا آخری ہفتہ تھا۔ ہلکی ہوا کی سرگوشیاں ساتھ بہتے چشمے کے پانی کی گنگناہٹ پر غالب تھیں۔ اس نے کٹیا کے سامنے کھانا پکایا اور خنکی کے سبب مجسموں کے قریب کھانا رکھ کر نکھری دھوپ میں بیٹھ کر کھانے کی تیاری کرنے لگا۔

"کیا بات ہے ''دوست''، آج تم بہت اداس دکھائی دے رہے ہو۔ گھبرایا ہوا تو مجھے ہونا چاہیے کیونکہ تمہاری دوستی کے سبب میں واجب القتل ٹھہرایا گیا ہوں۔ حالانکہ مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ تم رام، بھگوان، بدھ یا کس کے مجسمے ہو۔''

دونو جوان چھپتے ہوئے اس کے قریب آ چکے تھے۔

''دیکھو یہ ملحد ان بتوں کے سامنے نیاز کا کھانا رکھ کر اب مناجات کر رہا ہے۔ یہ قتل ہونے کے لائق ہی ہے۔'' ایک نے دوسرے کو کہا۔ وہ آہٹ سن کر متوجہ ہوا۔ دونوں جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ خوف زدہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، لیکن ایک لڑکے نے ہاتھ میں پکڑے پستول سے فائر کر دیا۔ گولی اس کی پیشانی سے پار ہو گئی۔ خون کے چھینٹے اڑے اور وہ کچھ بولے بنا ڈھیر ہو گیا۔ خون مجسموں کو رنگین کر گیا۔ گاؤں میں اس کے قتل کی خبر پھیلی تو اسلم دیوانہ وار بھاگتا ہوا ادھر آ پہنچا۔ وزیر کی کھلی آنکھیں آسمان کو تک رہی تھیں، جن میں خاموش سوال تیر رہے تھے۔ اسلم نے مجسموں کو خون میں رنگین دیکھا۔ سب کے چہرے پتھرائے ہوئے تھے۔ سرد نگاہیں جسم میں سرایت کر رہی تھیں۔ ''دوست'' کی دونوں آنکھوں پر چھینٹے پڑے تھے اور خون بہتا ہوا رخساروں پر جم گیا تھا۔

رئیس

مارکیٹ میں واقع وہ چند دکانیں کچھ الگ بنی ہوئی تھیں۔ایک لائن میں، ان کے سامنے جو راہداری تھی اس کے اختتام پر تقریباً تیس فٹ چوڑا اور سو فٹ لمبا گراؤنڈ تھا، جس میں کار پارکنگ والی طرف لکڑی کے مضبوط اور خوش نما بنچ پڑے تھے۔کچھ بنچوں کے اوپر کنوپی بنی ہوئی تھی اور چند بنچ کھلے آسمان تلے رکھے تھے۔شاید شہر کی انتظامیہ کے ذہن میں آیا ہو کہ سردیوں اور گرمیوں میں بیٹھنے کے لیے الگ الگ بندوبست کیا جائے۔

وہ دونوں پہلے کھلے آسمان تلے رکھے ایک بنچ پر تقریباً پانچ منٹ بیٹھے اور پھر وہاں سے اٹھ کر سایہ دار بنچ پر چلے گئے۔موسم کچھ ایسا تھا کہ دھوپ جسم کو چبھتی اور سائے میں خنکی کا احساس ہوتا۔دھوپ کی نسبت ہلکی ٹھنڈ قابل برداشت تھی۔دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔اس وقت مارکیٹ میں رونق ہو جاتی تھی لیکن آج ایسا نہیں تھا۔پارکنگ میں بھی فقط چند گاڑیاں کھڑی تھیں اور آخری کنارے کے ساتھ ایک پٹرول پمپ موجود تھا۔وہاں واقع سروس اسٹیشن پر دھلنے آئی کئی گاڑیاں اس پارکنگ میں کھڑی تھیں جن کو لڑکے صاف کر رہے تھے۔جو فارغ ہو چکے تھے فٹ پاتھ پر بیٹھے کار صاف کرنے والے پیلے رومال کندھوں پر ڈالے سگریٹ پی رہے تھے۔

''آج کوئی ہڑتال وغیرہ یا کوئی جلسہ جلوس تو نہیں ہے شہر میں؟'' ''تمہیں کیوں ایسا خیال آ گیا''

''اس لیے کہ مارکیٹ میں کم لوگ آئے ہوئے ہیں ورنہ اس وقت تک یہ پارکنگ گاڑیوں سے بھر جاتی ہے۔اور آج یہ آدھا خالی ہے۔''

''تم کیا روز مارکیٹ آتے ہو اس وقت؟''

"ہاں میں روز آتا ہوں۔ میرا دھندا ہی ایسا ہے"

''کیا دھندا کرتے ہو تم میرے دوست''۔

''کبھی کچھ کر لیا اور کبھی کچھ اور کر لیا۔ تمھاری طرح خاندانی رئیس تو ہوں نہیں جن کے کئی ایک لگے بندھے کاروبار ہوتے ہیں۔ ہم غریبوں کی تو ہوائی روزی ہوتی ہے۔ رازق کبھی ادھر سے رزق دے دیتا ہے اور کبھی کہیں اور سے''۔

ایک نوجوان اپنے ہاتھ میں چند لفافے لیے ان کے سامنے سے گزرا اور پارکنگ میں کھڑے اپنے موٹر سائیکل کی جانب جانے لگا۔ موٹر سائیکل پر لفافے رکھتے ہوئے ایک لفافہ اچانک اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر گر کر پھٹ گیا اور پیلے رنگ کی شکر سڑک پر پھیل گئی۔ وہ چند لمحے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا وہ سوچ رہا ہے کہ سڑک پر گری شکر سمیٹ کر کسی اور لفافے میں ڈال لے کیونکہ اس نے ہاتھ میں پکڑے لفافوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھا اور پھر انہیں سنبھال کر رکھنے کے بعد وہاں سے روانہ ہو گیا۔

چند لمحوں بعد اس بکھری ہوئی شکر کے قریب درجنوں مکوڑے جمع ہو گئے۔ ان کی نزدیک موجود بل اور اس شکر تک ایک سیاہ لائن بن گئی۔ وہ دونوں غور سے مکوڑوں کی آمد و رفت اور شکر کھانے کے عمل کو دیکھنے لگے۔ ساتھ درخت سے چند چڑیاں اڑ کر اس شکر کے پاس جا اتریں اور شکر کے ساتھ ساتھ مکوڑوں کو بھی ہڑپ کرنے لگیں، اس ناگہانی آفت سے ان میں سراسیمگی سی پھیل گئی اور وہ سب شکر کے پاس سے ہٹ کر غائب ہو گئے۔

''دیکھا تم نے رزق تقسیم ہونے کا عمل اور طریقہ کار، ہم غریبوں کو بھی ایسے ہی رزق ملتا ہے اور پھر طاقت ور ہمیں کھاتا دیکھ کر اسے بھی اپنے قبضے میں کرنے پہنچ جاتے ہیں۔''

''تمھیں تو اپنا رونا رونے کے علاوہ کوئی کام نہیں''

''میرے آقا میرے محترم یہ غریبی چیز ہی ایسی ہے جو انسان کو رلائے بنا چین سے بیٹھتی

نہیں۔''

''تم غریب لوگوں کے بھی عجیب مسئلے ہیں اور ایسے پیچیدہ کہ ایک کو ٹھیک کرو تو ساتھ والا الجھ جائے اسے سلجھاؤ تو پہلا بگڑا۔''

اگر ہمارے مسئلے سلجھنا شروع ہو جائیں اور کوئی الجھاؤ نہ آئے تو پھر غریبی کیسے زندہ رہے۔ اس بے چاری کو بھی تو اپنے زندہ رہنے کے لیے کسی کی زندگی کو اجیرن کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بھی تو بقا کا مسئلہ ہے میرے دوست۔''

تم بھی وہی گھسا پٹا موضوع لے کر بیٹھ گئے ہو۔ غریبی، غربت کی کاٹ، اس کی تکلیف اور اس تکلیف کو امرا طبقے کے نہ سمجھنے کی تکلیف۔ تمھیں یاد ہے جب ہم دونوں یونیورسٹی میں معاشیات میں ایم اے کر رہے تھے تو تمھیں ادب سے بڑا لگاؤ تھا۔ مجھے بھی کئی دفعہ تم کھینچ کر لے جاتے تو تھے حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں وہ انارکلی کے قریب مال روڈ کے پاک ٹی ہاؤس میں، وہاں عجیب ماحول ہوتا تھا۔ اکثر غزل نظم یا افسانہ سننے والوں کی کوشش ہوتی تھی کہ مہمان جو اپنی تخلیق پیش کر رہا ہے اسے یقین دلایا جائے کہ اس کا شاعر یا افسانہ نگاروں سے کوئی تعلق نہیں۔ اور وہ غزل، غزل کے زمرے میں نہیں اور نظم تو شاعری کے ماتھے پر سیاہ داغ ہے اور افسانہ پڑھنے والے کو پڑھنا نہیں آ رہا تو لکھا کیا ہوگا۔ کوئی اپنے آپ کو ترقی پسند کہتا کوئی رمزیہ لکھاری کوئی حقیقت پسند۔ یہ غربت تو انسان کی قدیم دوست ہے اس پر لکھنے والے ترقی پسند کیسے ہو گئے۔

''چھوڑ اس فضول بحث کو کوئی اچھی بات کرو''

''کیا غربت کا احساس ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے یا کسی وقت غائب بھی ہو جاتا ہے۔''

''تم ٹھہرے خاندانی رئیس تمھیں چھوڑ تمھارے دادا کو بھی کبھی فکر معاش نہ رہی ہوگی۔ تمہیں کیا خبر یہ کیسی بُری بلا ہے۔ تم نے کبھی کسی تندومند اور بھرپور درخت پر آکاس بیل چڑھی دیکھی ہے جو اسے مکمل ڈھانپ لیتی ہے، کہیں سے سبزہ نظر نہیں آنے دیتی۔ فقط اسی کا زرد رنگ ہر جانب ہوتا ہے۔ غریبی بھی ایسی ہی چیز ہے ہر مسرت و خوشی پر چڑھی ہوئی آکاش بیل۔ کاش انسان

افلاس کو ہلاک کرنے کا طریقہ ڈھونڈ لیتا تو اسے زندگی مل جاتی ابھی تو فقط عمر گزار رہا ہے۔ تم مجھے بتاؤ بہت امیر ہونے کا احساس کیسا ہوتا ہے اور تم امیر لوگ غریب کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہو۔ اپنی آرام دہ یخ بستہ مرسڈیز میں جاتے سڑک کنارے دھوپ میں جلتے پسینے میں شرابور عمر رسیدہ انسان کو سر پر بوجھ اٹھائے ڈگمگاتے قدموں جاتا دیکھ کر کیا احساس تمھارے دل میں ابھرتا ہے''

''تم نے تو پروفیسر تنویر صاحب کی طرز پر اتنا لمبا سوال کر دیا کہ سوال کا آخری سرا سنبھالنے تک پہلا حصہ دماغ سے سرک جائے۔''

اُس نے سوال دوبارہ دھرا دیا

''امیر ہونا زبردست احساس ہے'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا اور پھر بولا۔''امیر ہونا بھی زبردست ہے اور اس کا احساس ہونا بھی کمال کا تجربہ ہے۔''

ہم دونوں ایک ہی بنچ پر بیٹھے ہیں۔ ہم عمر بھی ہیں بچپن کے دوست ہیں یونیورسٹی میں کلاس فیلو بھی تھے۔ یہ خدا کی مرضی ہے میں ارب پتی ہوں۔ جس گھر میں میں رہتا ہوں وہ کم از کم پندرہ کروڑ کا ہوگا۔ تقریباً چالیس کروڑ کا میرا لندن کے نواح میں گھر ہے۔ چار ٹیکسٹائل ملز ہزار ایکڑ زرعی زمین۔ وہ گاڑی دیکھو اس کی قیمت دو کروڑ سے زیادہ ہے''

اس نے جدھر اشارہ کیا وہاں نئی سیاہ رنگ کی ایس 500 مرسڈیز کو ایک باوردی ڈرائیور دو آدمیوں سے صاف کروا رہا تھا۔

''میرے پاس کم از کم پچاس کروڑ بنک میں پڑا ہوگا۔ اس وقت ہم دونوں ساتھ بیٹھے ہیں تم بھی فرض کر لو کہ تمھارے بھی بنک میں پچاس کروڑ پڑے ہیں۔ تم بھی عالیشان محل نما گھر میں رہتے ہو۔ تم اپنے اندر امیر ہونے کا احساس تو پیدا کر کے دیکھو کتنا لطف آئے گا۔''

''خیال واحساس حقیقت کے بغیر تو بلبلے کی مانند ہی ہوگا بننے کے چند لمحوں بعد ختم۔''

''ابھی باتیں کرتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایسا بھی وقت ہوتا ہے جب امیر

اور غریب میں فرق ختم ہو جاتا ہے تب دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں، ان کے جذبات اور احساسات میں فرق مٹ جاتا ہے اور ان کی سوچ ایک ہی ڈگر پر آ جاتی ہے۔ جب کچھ دیر کے لیے دونوں کے ذہن سے امیری اور غریبی کا خیال نکل جاتا ہے۔"

"تم غریب لوگوں کے ساتھ یہ بڑا عذاب ہے کہ ہر چیز میں کیڑے نکالنے لگتے ہو۔

ہر وقت حالات کا رونا، مجھ جیسا رئیس تمھارا بچپن کا دوست ہے کیا میں نے کبھی تمھیں محسوس ہونے دیا ہے کہ میرے اور تمھارے میں کتنا بڑا فاصلہ ہے امیر اور غریبی کا۔

"رئیس صاحب بس کرو اب اس بحث کو اور چلیں سروس اسٹیشن پر وہ گاڑی دھل چکی ہوگی جسے ہم نے خشک کر کے صاف کرنا ہے۔"

وہ خالی نظروں سے اپنے دوست کو دیکھنے لگا جیسے اس کی بات کو سمجھ نہ پا رہا ہو۔ پھر مسکرا دیا۔

"تم بڑے کم ظرف اور چھوٹی سوچ کے مالک اور حاسد ہو۔ مجھے کچھ دیر کے لیے تصوراتی رئیس بھی برداشت نہیں کر سکے اور حقیقت یاد دلا دی۔ وہ دونوں بنچ سے اٹھ کر کندھوں پر کار صاف کرنے والے پیلے رومال ڈالے سروس اسٹیشن کی جانب چل دیئے۔

شاہ برج

بارش کافی دیر برسنے کے بعد رک چکی تھی۔ ماحول پر خاموشی چھا گئی، لیکن پرنالوں سے پانی گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں یا پرندوں کا شور جو درختوں سے اڑ کر فضا میں چکر کاٹ رہے تھے۔ کوؤں کی کائیں کائیں سب پر حاوی تھی۔ دریائے جمنا کے کنارے جہاں سے ایک بجرا گزر رہا تھا وہاں زیادہ درخت نہ تھے، فقط چھوٹی بڑی جھاڑیاں تھیں اس لیے وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پانی کے بہاؤ کے ساتھ اسی رفتار سے سفر کرتا ہوا۔ ادو سفید بگلے اس کے چوکور بادبان کے اوپر اونچائی میں چکر کاٹ رہے تھے، مگر نجانے کیوں۔ شاید اس امید پر کہ کھانے کی کوئی چیز بجرے کے مکین ان کے لیے پانی میں ڈالیں گے۔ وہ بادبان مختلف رنگ کے کپڑوں کو اکٹھا کر کے بنایا گیا تھا۔ بارش کی وجہ سے کپڑے کے شوخ رنگ وقتی طور پر مدھم پڑے ہوئے تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ ایک خاندان اس کا مستقل رہائشی ہے۔ اس میں بانسوں کے چھپر کے نیچے چند چار پائیاں پڑی تھیں جن پر کچھ مرد و زن بیٹھے تھے۔ دو بچے ان بکریوں سے کھیل رہے تھے جو ایک کونے میں کھڑی چارہ کھا رہی تھیں۔ اس کی نگاہ بجرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس عمر رسیدہ آدمی پر ٹک گئی جو ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ اس کے سفید لمبے بال سر پر باندھے کپڑے سے باہر تقریباً کندھوں تک آئے ہوئے تھے۔ ایک جوان لڑکا چار پائی پر اُس کی ٹانگوں کی جانب بیٹھا آہستہ آہستہ اس کی پنڈلیوں پر شاید تیل کی مالش کر رہا تھا۔ یہ نوجوان اس کا کیا لگتا ہوگا بیٹا یا پوتا؟؟ اس کی سوچ ٹھہر سی گئی اور وہ خالی نظروں سے بجرے کو دور ہوتے ہوئے درختوں کے پیچھے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔

وہ دن کا بیشتر حصہ اسی برج کے نیچے بیٹھا جمنا اور شاہی محل کے درمیان سے گزرتے راستے پر

آنے جانے والے لوگوں کو دیکھتا رہتا۔ اس راستے پر گزرتا کوئی عمر رسیدہ شخص اپنے کنبے کے ساتھ ہنستا مسکراتا خوش و خرم جا رہا ہوتا تو وہ رنجیدہ ہو جاتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ محل کی بلند عمارت سے باہر نکل کر ننگے پاؤں اس دھول میں اٹے راستے پر چل رہا ہوتا۔ اپنے بیٹوں اور پوتوں سے باتیں کرتے ہوئے، کسی گدھے یا مریل خچر کی لگام تھامے آزادی اور بے فکری سے جمنا کے پانیوں کے سنگ سفر کرتا۔ سوائے اپنے چند آدمیوں کے کنبے کے اسے پہچاننے والا کوئی نہ ہوتا۔ شام کو اپنے کچے گھروندے میں تھکاوٹ سے چور روکھی سوکھی کھا کر کنبے سے باتیں کرنے کے بعد بے فکری کی نیند سو جاتا۔

عالم پناہ، ظل سبحانی، جہاں پناہ، شہنشاہ ہندوستان، سکندرِ دوران رستمِ زماں، آفتاب خاندان مغلیہ، نگاہیں جھکی رہیں، با ادب، با ملاحظہ، بندہ پرورِ عالم تشریف لا رہے ہیں۔ محلات کی غلام گردشوں اور راہداریوں سے بلند ہوتی وہ بارعب پکاریں، گھنگھروں اور شہنائیوں کی مدھر آوازیں، جوانی کے نشے میں مخمور پری جمال گل بدن کنیزوں کی ہنسی، ہلکی لے میں گنگنانے کی آواز۔ ادب، عزت، توقیر اور تمکنت کی ایسی فراوانی کہ آدمی اپنے کو انسان سے ماورا مخلوق سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔ کیا وہ سب کچھ تھا یا اس کا وہم ہے۔ دریا کے پار تاج محل کو بہت دیر دیکھتا رہا۔ نگاہ واپس آتے ہوئے پانی کے اوپر چلتی ہوئی جب اس کنارے اتری تو دیکھا کہ قلعہ کی بلند فصیل سے کچھ فاصلے پر کیکر کے درخت کے نیچے گدھا بندھا ہوا ہے اور ایک سانولے رنگ کا نوجوان جس نے ایک دھوتی باندھ رکھی تھی زمین پر ایک پرانی دری بچھانے کے بعد ایک شخص کو جو کیکر کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا بڑے پیار اور احترام کے ساتھ بازو سے پکڑ کر اس دری تک لایا اور پھر اسے وہاں لٹا دیا۔ واپس اپنے مختصر سامان تک گیا جو کیکر کے نیچے دھرا تھا۔ وہاں سے ایک بوسیدہ سی چادر نکالی اور ایک سرہانے کی طرح اس شخص کے سر کے نیچے رکھ دی۔ کچھ دیر ساتھ بیٹھ کر اس کی ٹانگیں اور پاؤں دباتا رہا۔ پھر وہاں سے اٹھا اور اِدھر اُدھر سے چند پتھر تلاش کیے انہیں نیم دائرے میں اوپر نیچے رکھ کر چولہا تیار کیا، لکڑیاں جمع کر کے آگ روشن کی اور ایک چھوٹی سی

چھاگل سے دودھ نکال کر آگ پر رکھی دیگچی میں ڈالا اور ساتھ دلیا شامل کر کے پکانے لگا۔

شام ڈھل چکی تھی، اُس لڑکے اور لیٹے آدمی کا ہیولا جلتی آگ کے سبب نظر آ رہا تھا۔

''عالم پناہ آپ کا کھانا چُن دیا جائے یا کچھ دیر بعد تناول فرمائیں گے۔'' اُس کی بیٹی نے شاہ برج میں اس کے نزدیک آتے ہوئے سوال کیا۔ کچھ دیر جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ دوبارہ بولی "شاہ بابا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آپ آج کچھ اُداس دکھائی دے رہے ہیں۔" اُس نے چونک کر ساتھ کھڑی بیٹی کی طرف دیکھا۔'' "ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو" اس نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر ذرا سیدھے ہوتے ہوئے کہا اور قالین پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''میں ان دونوں کو کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں" اس نے لڑکے اور لیٹے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ باپ کو دودھ ملا دلیا کھلانے کے بعد اس نے کچھ اور لکڑیاں جمع کر کے بجھتی ہوئی آگ کو تیز کر دیا تھا۔ جس سے کافی روشنی ہو گئی تھی۔ درخت کے نیچے بندھا ہوا گدھا بھی نظر آ رہا تھا۔

''اگر ایک پرندہ سونے کے خوبصورت وسیع پنجرے میں بند ہو پنجرے پر نایاب جواہرات لگے ہوں، پانی اور خوراک کے لیے بھی مرصع سونے کے برتن ہوں، کھانے پینے کی کمی نہ ہو، تم کیا خیال کرتی ہو وہ خوش قسمت ہے؟ یا اس کا وہ ہم جنس جو سارا دن خوراک کی تلاش میں سرگرداں، جگہ جگہ شکاری کا دھڑکا، لیکن آزاد اور خود مختار''

''دیکھو کتنا فرمانبردار ہے وہ لڑکا'' بیٹی کا جواب سننے سے قبل ہی اس نے نیچے قلعہ کی دیوار کے قریب بیٹھے اس لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو باپ کے پہلو میں بیٹھا بڑے انہماک سے باتیں کر رہا تھا۔

''کیا یہ لڑکا کبھی سوچ سکتا ہے اپنے باپ کو اذیت پہنچانے کا۔ تمھیں یاد ہے وہ شام۔ آہ کیا بھیانک شام تھی وہ میری زندگی کی، اُسی شام سے میری زندگی کا سورج ڈوب چکا ہے۔ زندگی میں گزری خوشیاں، راحتیں، امنگیں، پوری ہوتی آرزوؤں کے ہجوم سب بھول گئے کچھ یاد نہیں رہا۔ فقط میں ہوں اور میری بے بسی۔ کیا تمھیں احساس ہے کہ بے بسی اور بے چارگی کا ذائقہ کس قدر تلخ

ہوتا ہے۔" وہ چپ چاپ بیٹھی باپ کے چہرے پر آتے جاتے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ "تمھیں اس درد اور اندوہ کی گہرائی کا اندازہ ہے جب یہ بد بخت خواجہ سرا اعتبار میرے پاس ایک بڑا خوان لایا تھا جو اوپر سے ڈھکا تھا۔ تم بھی میرے ساتھ دستر خوان پر موجود تھیں ابھی ہم نے کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ کافی دنوں بعد اُس احسان فراموش خواجہ سرا کی شکل نظر آئی تھی۔ اس ظالم نے مجھے سلام کرنا بھی مناسب نہیں جانا تھا۔ اس نے وہ خوان عین میرے سامنے دستر خوان پر رکھا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر خاموش کھڑا مجھے طنزاً دیکھتا رہا۔ مجھے اس کی اس بے حیائی اور جرأت پر حیرت ہو رہی تھی لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ اب یہ اس قلعہ کا قلعہ دار ہے اور میں ایک مجبور قیدی۔ کچھ دیر بعد وہ بڑے معنی خیز لہجے میں بولا تھا کہ دہلی سے میرے فرماں بردار بیٹے نے مجھے تحفے میں وہ بھیجا ہے اور ساتھ کہا ہے کہ یہ خوان باپ کے سامنے اس وقت رکھا جائے جب وہ کھانا شروع کرنے والے ہوں۔ آپ کے لائق اور فرماں بردار فرزند آپ کو ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ خوان میں کوئی خاص مربہ یا حلوہ ہوگا۔ افسوس صد افسوس، میں گناہ گار ہی ایسا ہوں۔ میں نے گناہوں کا بار عظیم اٹھا رکھا ہے۔ میرا جو اتنا کڑا امتحان لیا گیا۔ جو سزا اس دنیا میں مجھے ملی وہ ٹھیک ہی ملی۔ تمھیں معلوم ہے ساری اولاد میں میرا منظور نظر اور لاڈلا تمھارا سب سے بڑا بھائی تھا۔ اگرچہ اس کی چند کوتاہیوں اور حکم عدولی نے اُسے اور مجھے اس حال پر پہنچایا، مگر باقی بھائیوں کی نسبت وہ زیادہ تابعدار تھا، وہ نرم خو اور رحم دل بھی تھا، کیا کوئی تصور میں لا سکتا ہے وہ لمحہ اس غم آگین تیر کا زخم، چوٹ کی وہ شدت جب ڈھکنا اس ظالم خواجہ سرا نے اٹھایا تھا۔ میری نظر اپنے لختِ جگر اپنی روح اپنے وجیہہ بیٹے کی اپنی طرف دیکھتی کھلی بے نور آنکھوں سے جب ٹکرائی تھی۔ غش کھا کر اوندھے منہ دستر خوان پر گرنے سے میرا یہ دانت ٹوٹ گیا تھا۔ اُس نے انگلی دانت والی جگہ پر رکھتے ہوئے بیٹی کو دکھایا تھا۔ اُس کے آنسو گالوں پر بہنے لگے جہاں آرا نے قریب ہوتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے سفید ریشمی رومال سے اس کے آنسو پونچھے اور دائیں ہاتھ کو

پکڑا کر اُسے چومنے کے بعد اپنے سینے سے لگا لیا۔

"بابا آپ صبر کریں۔ خدا سب دیکھ رہا ہے وہ ان تمام مظالم کا ضرور حساب لے گا۔ آپ پر ظلم کرنے والا گستاخ ضرور بدلہ پائے گا۔" "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مالک کا اپنا طریقہ کار ہے وہ کبھی تو فوراً گرفت میں لے لیتا ہے۔ شکنجہ کس دیتا ہے۔ کبھی زندگی بھر مہلت دے ڈالتا ہے کیونکہ سزا دینے کی جلدی اسے ہوتی ہے جسے خوف ہو کہ مجرم اس کی گرفت سے بچ کر بھاگ جائے گا۔ خداوند تعالیٰ سے کون اور کہاں فرار ہو کر جا سکتا ہے۔ اس زندگی اور دنیا کا ہزار سال اس کے جاودانی وقت کا ایک لحظہ ہوگا۔ اسے انتقام، بدلے اور سزا کی جلدی نہ ہے نہ اس کی ضرورت رکھتا ہے۔" وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ جہاں آرا نے ساتھ رکھی میز پر دھری ایک سنہری صراحی سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اسے پیش کیا۔ آہستہ آہستہ گھونٹ بھرتے ہوئے وہ نیچے قلعے کی دیوار سے پار دریائے جمنا کے کنارے کی طرف دیکھنے لگا۔ ادھر مکمل تاریکی تھی، آگ بجھ چکی تھی اس لیے وہ نوجوان لڑکا اور اس کا باپ اب نظر نہیں آ رہے تھے۔ جھینگروں اور مینڈکوں کی مشترکہ آوازیں ایک تسلسل سے سنائی دے رہی تھیں۔

یہ جھینگر اور مینڈک بولتے بولتے تھکتے بھی نہیں۔ رات گئے تک شور کرتے رہتے ہیں۔ میں بھی رات کا اکثر حصہ جاگ کر گزارتا ہو۔ اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کتنی دیر بولنے کے بعد سب کے سب ایک دم خاموش ہو جاتے ہیں اور پھر شور شروع کر دیتے ہیں جیسے آپس میں مشورہ کر کے بولنا شروع کرتے ہیں۔ چاندنی راتوں میں ان کا شور مجھے اچھا لگتا ہے اس اچھا لگنے میں بھی خوشی کا کوئی عنصر شامل نہیں ہوتا۔ البتہ کم مائیگی کا احساس کچھ دب سا جاتا ہے۔ اندھیری راتوں میں ٹرّانے کی آواز غم ناک ہوتی ہے۔ کئی دفعہ بچوں کی مانند تصورات کی دنیا میں کھو جاتا ہوں۔ دل چاہتا ہے۔ کسی جادو کے سبب انسان سے جھینگر کا روپ اختیار کر جاؤں سکون سے دریا کنارے گھنی جھاڑیوں میں زندگی کے چند دن گزاروں شام ڈھلے مشترکہ شور کیا اور دنیا چھوڑ کے چل دیئے یہ جھینگر مجھ سے کہیں خوش اور سکھی ہوں گے۔

کئی سال قبل جب محل میں مینا بازار لگا کرتے، کیا رونق اور ہنگامہ ہوتا تھا۔ خاص طور پر رات کو رنگ ونور، حسن و جمال کا سیلاب ہوتا۔ رات بھر موسیقی کی محفلیں، ضیافتیں، امرا کی بہو بیٹیاں اور بیویاں غیر ملکی تاجروں کے سامان سے دوکانیں لگا کر بیٹھی ہوتیں۔ مجھے یاد ہے بلکہ کئی دفعہ میں نے اس پر غور کیا تھا کہ جب موسیقی کی لے تیز ہوتی تھی تو یہ جھینگر تقریباً خاموش ہو جاتے جیسے اپنا شور ختم کر کے سُر تان سے لطف لے رہے ہوں۔

شاہ بابا جو آخری مینا بازار تھا وہ کئی دن چلا تھا، اس کی رونق دیدنی تھی اکثر صوبہ داروں کی بیویاں بیٹیاں اور پری جمال کنیزیں شامل ہونے آئیں تھیں لیکن اسی منحوس مینا بازار میں آپ کی طبع ناساز ہو گئی۔ اور ساری سلطنت کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ وہ تاروں بھری رات کی وسعتوں کو دیکھنے لگا۔ اس کا ذہن حجرۂ خاص میں پہنچ گیا۔ جہاں وہ اپنی ایک پسندیدہ کنیز کے ساتھ تھا وہ ترک کنیز انتہائی خوبصورت اور چنچل تھی۔ وہ بے تکلف گفتگو بھی کر لیا کرتی۔ اُس نے آرمینیہ سے آئی ہوئی ایک جوان سال اور گل بدن کنیز، جس نے چند دن قبل شہنشاہ کے ساتھ شب بسری کی تھی کے متعلق بتایا کہ وہ کہہ رہی تھی شاہِ عالم اب بڑھاپے کی طرف گامزن ہیں۔

اس نے وہ بات سنی ان سنی کر دی لیکن اس کے دل کو چوٹ لگی تھی۔ علی الصبح شاہی معالج کو طلب کیا گیا اور عمدہ شباب آور معجون کا حکم صادر ہوا اور ساتھ ہی حکیم کی کارکردگی پر اظہار ناراضگی کیا۔ دو دن بعد جو معجون اسے پیش کیا گیا اس کے متعلق معالج رطب اللسان تھا اور اس کے اثرات اور فوائد پر اس نے بہت کچھ کہا۔ معجون کھاتے اسے یقین تھا کہ اب کے بعد اس کا بڑھاپا چھپا رہے گا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے سبب اس کا پیشاب رک گیا حکما میں سراسیمگی پھیل گئی۔ معالج خاص کو گرفتار کر لیا گیا۔ بادشاہ کی بیماری کی خبر جنگل کی آگ کی مانند سارے ملک میں پھیل گئی۔ بلکہ یہاں تک بات پہنچی کہ اُس کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کا بڑا بیٹا جو پاس رہتا تھا اس نے امور سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ باقی تین بیٹے جو مختلف علاقوں کے صوبہ دار تھے وہ اپنے لشکر لیے دارالحکومت کی طرف بڑھنے لگے۔ حکما کی جان توڑ کوششوں سے شہنشاہ کا پیشاب تو جاری ہو

گیا مگر اس کے بیٹوں کے لشکر روانہ رہے ان کو آگرہ کی طرف آنے سے روکا نہ جا سکا۔ اس نے خطوط لکھ کر سب کو تسلی دی کہ وہ خیریت سے ہے، روبصحت ہے۔ لیکن قدرت کا مہرہ چل چکا تھا۔ اُس نے ٹھنڈی سانس بھری خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ آیا۔ معمولی سی لاپروائی چھوٹی سے غلطی کیسے مہلک نتائج کی حامل ہوسکتی ہے وہ بیٹی کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔

وہ کافی دیر خاموش رہا۔ باپ بیٹی خاموشی سے بیٹھے رہے۔ "میں کافی عمر گزار چکا ہوں لیکن دنیا کو نہیں سمجھ پایا۔" گلا صاف کرتے ہوئے اس نے خاموشی کو توڑا۔ "دنیا کو تو کیا سمجھ پاتا میں تو اپنے بیٹوں کو نہ سمجھ سکا۔ مردم شناسی مجھ میں نہیں تھی۔ میرا دنیاوی طور پر کامیاب ہو جانے والا فرزند کتنا ہوشیار اور سفاک نکلا۔ اپنی منزل پا لینے سے قبل وہ ہر ایک کو یہ تاثر دینے میں کامیاب رہا کہ اسے دنیا یا دنیاداری سے کوئی رغبت نہیں۔ وہ حکمرانی یا تاج شاہی کا نہ خواہش مند ہے اور نہ اپنے کو اُس منصب کے لیے مناسب خیال کرتا ہے کہ وہ ایک درویش منش انسان ہے۔ نماز روزہ ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے اکثر امرا اور سالارانِ لشکر سے اچھے تعلقات رکھتا ان سے انتہائی عزت سے پیش آتا۔ مجھ سے جب بھی ملاقات کے لیے آتا اتنی عزت، عقیدت اور فرماں برداری دِکھاتا کہ مجھے باپ ہونے کے باوجود اس کے طرزِ عمل سے خوشامد اور ریاکاری کی بو آتی۔"

''میں نے اسے ملتان کا صوبہ دار بنا کر روانہ کیا۔ وہ اس بات پر خوش نہ تھا۔ ملتان جانے کے بعد اس نے اپنے بڑے بھائی اور ولی عہدِ سلطنت کو متعدد خطوط لکھے جن میں اس نے اپنی انتہائی نیاز مندی، عاجزی اور بڑے بھائی سے اپنی وفاداری اور محبت وعقیدت کا اظہار کرنے کے بعد درخواست کی کہ اسے ملتان کی بجائے دکن کا صوبہ دار اور حاکم بنا دیا جائے۔ جب چھوٹے بھائی کی سفارش کرنے کے لیے وہ میری خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اسے سمجھایا کہ اس کا ملتان رہنا بہتر ہے۔ دکن بہت بڑا اور امیر صوبہ ہے اگر وہ وہاں کا حاکم مقرر کر دیا گیا تو اس کے اثر ورسوخ میں بہت اضافہ ہو جائے گا اور ساتھ ہی وہ بنگال اور بہار کے علاقوں میں اثر انداز ہوگا اور یہ بات

ولی عہد سلطنت کے لیے خطرناک نتائج کی حامل ہوگی، لیکن اس نے اسے ایسا شیشے میں اتار لیا تھا کہ وہ بضد رہا کہ اسے صوبہ دار دکن مقرر کر دیا جائے۔ آخر کار مجھے اپنے جان سے عزیز فرزند کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور اسی کی سفارش پر تمھارا وہ مکار بھائی دکن کا حاکم بن گیا اور نتیجہ تم نے دیکھ لیا۔ اپنے محسن اور شفیق بڑے بھائی کا سر قلم کروا کر اس نے میرے سامنے دسترخوان پر رکھوا دیا۔"

"وہ کیا بھیانک انتقام تھا جو ایک بوڑھے قیدی باپ سے اس نے لیا اس درویش منش خادم دین اللہ، پابند شریعت نے اپنے تمام بھائی اور بے گناہ معصوم بھتیجے قتل کروا ڈالے تاکہ اُس کی سلطنت کے لیے کوئی معمولی خطرہ بھی نہ رہے۔ اقتدار اور طاقت کا نشہ انسان کو باؤلا کر دیتا ہے اور اس کے چھن جانے کا خوف آدمی کو سفاکیت کی معراج تک لے جاتا ہے۔ ایسے میں ہر سمت ہر جانب اپنی ذات ہی نظر آتی ہے اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔" اس کی آواز بے ربط ہونے لگی۔ بولتے بولتے وہ تھک گیا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ بولتا چلا جائے۔

"میں جب بلند قامت ہاتھی پر سوار قلعہ آگرہ کے مرکزی دروازے سے جلوس کی شکل میں نکلتا، سونے اور قیمتی جواہرات کے زیورات سے ہاتھی لدا ہوتا۔ ہودہ سونا چاندی سے بنا ہوتا۔ ارد گرد امرا کے ہاتھی، سینکڑوں چاق و چوبند گھڑسوار ہاتھوں میں لمبے نیزے لیے پہرہ دار، کسی شخص کی مجال نہ ہوتی کہ نگاہ اٹھا سکے۔ میری رعایا عقیدت سے جھکتی ہوئی تقریباً سجدہ ریز ہوتی جدھر سے ہماری سواری گزرتی۔ نفیریاں، طبل، تاشے کے ساتھ بلند آواز سے میری آمد کا اعلان ہو رہا ہوتا۔ میری شہنشاہیت، میری سخاوت، دلیری، اولوالعزمی، ظل سبحانیت، اختیار و جبروت، میری بندہ پروری، رعایا نوازی، عدل و انصاف، کشور کشائی اور بے مثل و بے مثال حکومتی نظام کے ترانے پڑھے جاتے۔ دنیا کا سب سے بلند بخت سب سے خوش قسمت سب سے بڑا حکمران کہا جاتا۔ مجھے بڑا فخر محسوس ہوتا کہ لوگ ہمارے خاندان کے کتنے وفادار ہیں۔ مجھ سے کتنی محبت اور والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا وفاداری، احسان مندی، دلیری اور ثابت قدمی بنیادی انسانی وصف ہیں۔ اکثر

دل میں آتا کہ میرے امرا اور درباری بہت نمک حلال اور میرے انتہائی وفادار ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں میری وفاداری اور فرماں برداری سے نہیں ہٹا سکتی اور یہ زمانہ ہمیشہ اسی طرح میرا مطیع وفرمانبردار رہے گا۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اور امرائے سلطنت حالتِ رکوع میں رہتے دورانِ گفتگو ان کی نگاہیں میرے قدموں سے بلند ہونے کی جسارت نہ کرتیں میرا ہلکا سا اشارہ خاندانوں کے مقدر بدل دیتا تھا۔

سموگڑھ کے میدان میں ولی عہد سلطنت کو شکست ہوئی۔ میں نے بہت کوشش کی تھی کہ بذات خود لشکر کی قیادت کروں کیونکہ ایسی صورت میں کبھی باغی شہزادے کی فوج شاہی فوج سے لڑائی پر آمادہ نہ ہوتی لیکن چند غدار ناعاقبت اندیش امرا نے ولی عہد کو جیت کا یقین دلایا تھا اور وہ فتح کا سہرا میرے بجائے اپنے سر سجانا چاہتا تھا۔ افسوس اس کی ضد نے مجھے برباد کر دیا۔ شکست کی خبر جب پہنچی تو کوئی میرے ساتھ نہ رہا۔ تمام لشکر دار اور قدیم وفادار درباری امرا عجلت میں باغی فتح یاب شہزادے کے پاس پہنچ گئے۔ فقط ایک اسد خان میرا وفادار رہا اور وہ میری نظر بندی تک میرے دروازے پر حاضر رہا۔

''شہنشاہ عالم! کنیز کا سلام قبول ہو'' ایک دروازے سے تاتاری کنیز نے داخل ہو کر اسے فرشی سلام کیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر شہزادی جہاں آرا کی طرف دیکھا، وہ بھی سمجھ گیا کہ کنیز کھانے کے متعلق پوچھنے آئی ہے۔ میری طبیعت بوجھل ہو رہی ہے میں کھانا نہیں کھاؤں گا تم فقط ایک گلاس دودھ پیش کرو۔ وہ کورنش بجالا کر چلی گئی۔

''سارے ملک ہندوستان میں تمھارے علاوہ یہ چند کنیزیں ہیں جو آج بھی مجھے جہاں پناہ اور شہنشاہ عالم کہہ کر مخاطب کرتی ہیں'' اس نے ساتھ بیٹھی بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

کچھ دیر وہ خاموش رہا اور بارہ دری کی چھت پر بنے پھول بوٹے جن میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے اور اردگرد سونے کے پانی سے نقش ونگار بنائے گئے تھے ان کو دیکھتا رہا۔

"میرے ایک اتالیق تھے جو لڑکپن میں مجھے پڑھایا کرتے تھے۔" وہ بیٹی سے مخاطب ہوا لیکن اس کی نگاہیں بدستور بارہ دری کی چھت پر مرکوز تھیں۔ "میرے وہ استاد بہت بڑے عالمِ دین تھے فلسفہ اور منطق پر بھی انہیں عبور حاصل تھا۔ وہ بلند پایہ دانشور تھے انہوں نے مجھے امیر المومنین جناب علیؓ ابن ابی طالب کا ایک قول سنایا تھا جو مدتوں بعد آج مجھے یاد آیا۔ انہوں نے فرمایا تھا۔"

''استاد سبق دے کر امتحان لیتا ہے مگر دنیا امتحان لے کر سبق دیتی ہے''

"واہ کیا بات اور کیا حقیقت بتائی جناب علیؓ نے۔ یہ دنیا میرا کڑا امتحان لے چکی نہ بھلانے والا مجھے سبق دے چکی۔"

''ادھر میرے نزدیک آؤ''

وہ سرک کر اس کے بالکل قریب آ گئی۔ اس نے جہاں آرا کا سر اپنے کندھے سے لگالیا۔

"میری صحت اب خراب ہو چکی ہے۔ معلوم نہیں کب پیغام اجل آجائے۔ میرا خیال ہے میرے مرنے کے بعد تمھارا بھائی تم سے بہتر رویہ رکھے گا اور اگر تم سے کوئی ناراضگی ہے بھی تو شاید تم سے بُرا سلوک نہ کرے، مجھے تمھاری ہر وقت فکر رہتی ہے۔"

اُس نے دونوں ہاتھ بلند کئے اور چہرہ آسمان کی طرف کر کے بولا

''اے مالک ارض وسما اب بس کر دے میرے بے حساب گناہ ہیں جن کی شاید مجھے ابھی سزا نہ ملی ہو لیکن اب مجھ میں طاقت اور ہمت نہیں رہی۔ آٹھ سال گذر گئے مجھے ان کمروں میں قید ہوئے اور ذلت آمیز سلوک کو سہتے ہوئے۔ تو دیکھ رہا ہے میرے انتہا پسند اور تنگ نظر بیٹے نے میرے ساتھ کیا رویہ رکھا ہوا ہے۔ مہینے میں ایک آدھ دفعہ میرا دل چاہتا ہے کہ چہل قدمی کے لیے انگوری باغ میں چلا جاؤں جو قلعہ کے اندر ہی ہے لیکن کئی کئی دفعہ درخواستیں کرنے کے بعد وہ خواجہ سرا اعتبار مجھے شاہ برج سے باہر قدم رکھنے کی اجازت دیتا ہے ایک کم ظرف نیچ خواجہ سرا میری زندگی کا مختار بنا ہوا ہے۔

اے رحمان اے عادل اے معاف کر دینے والے تو نے تو کہا ہے کہ جب والدین بڑھاپے کو پہنچ جائیں ان کو اف تک نہ کہو۔ ساتھ ہی تو نے فرمایا ہے کہ تو مشرک اور والدین کے نافرمان کو نہیں بخشے گا۔ اے جبار وقہار تو نے بہت سے لوگوں کو انکے گناہوں کا دنیا میں ہی مزہ چکھایا ہو گا۔ بے شمار باپوں کے سامنے ان کے جوان بیٹوں کے کٹے سر دشمنوں نے رکھوائے ہوں گے۔ لیکن شاید ہی کوئی مثال ہو کہ بغیر جرم وخطا ایک فرزند نے جو بظاہر پارسائی کا دعویدار ہو اس نے باپ کی سلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد باپ کو قید کر دیا اور پھر سگے بڑے بھائی کا سر کٹوا کر باپ کے سامنے رکھوا دیا۔"

"اے میرے مالک اے غفور الرحیم میں روز قیامت اس کا گریبان ضرور پکڑونگا۔ بارِ الہا اب اسے لوگوں نے خوشامداً زندہ پیر کہنا شروع کر دیا ہے۔ تو جانتا ہے یہ اقتدار یہ سلطنت یہ روپے کی طاقت لوگوں کو کیسے اندھا اور بہرہ بنا دیتے ہیں کہ انسان بے ضمیر اور زندہ پیر کا فرق بھول جاتے ہیں۔ دونوں کی تمیز ختم کر دیتے ہیں۔ اے میرے مالک اب مجھ پر رحم کر دے اپنا کرم اور احسان فرما۔ شافع محشر رسول اکرمؐ کے صدقے اس بیچ اور گناہ گار کے دن کم کر دے۔ مجھے اپنے پاس بلا لے۔ اور پھر وہ سسکیاں لیتے ہوئے ساتھ رکھے بستر پر دراز ہو گیا۔ بیٹی کا ماتھا چوم کر اسے چلے جانے کا کہا۔

اگلی صبح کنیز جگانے آئی لیکن مالک وقت نے اس کی فریاد سن لی تھی۔

شکار

گندم کی فصل تقریباً ایک فٹ بلند ہوگی۔ سرسبز اور لہلہاتی۔ اوس پڑنے سے دھل گئی تھی۔ دھوپ نکلے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ کسی کسی پتے پر اب بھی ایک آدھ اوس کا قطرہ چمک رہا تھا۔ ''فکر نہیں کرو اب گندم کے پودے گیلے نہیں ہیں اور ہمارے بوٹ اور پتلون کے پائنچے گیلے نہیں ہونگے۔'' اس نے کھیت میں اترنے کا کہا۔ اس کا دوست ایک سلجھا ہوا متین اور پڑھا لکھا انسان تھا۔ کل شام وہ اس کے ساتھ شہر سے گاؤں آیا تھا۔ اگرچہ اس کے دوست کو شکار سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی آج سے قبل وہ کبھی شکار پر گیا تھا۔ مگر وہ اس کے مجبور کرنے پر شکار کے پروگرام کا حصہ بن گیا تھا۔ رات وہ گاؤں میں ٹھہرے اور صبح تقریباً پندرہ افراد پر مشتمل شکار پارٹی بمعہ تین کتوں کے تین گاڑیوں پر سوار ادھر پہنچے تھے۔ جو علاقہ شکار کے لیے چنا گیا تھا وہاں وسیع علاقے پر گندم کی فصل کاشت تھی اور فصل کے بیچوں بیچ اور اردگرد سرکنڈوں کی ایکڑوں پر پھیلی جھاڑیاں تھیں کافی تعداد میں سرکنڈوں کے ساتھ شیشم اور کیکر کے درخت تھے۔

یہاں بھورا اور کالا تیتر اچھی تعداد میں مل جاتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سرکنڈوں میں سور اور خرگوش بھی تھے۔ گاڑیوں سے اتر کر جب وہ بندوقیں درست کر رہے تھے تو ایک ساتھی نے کہا تھا کہ سرکنڈوں میں سور بھی ملیں گے اس لیے سب شکاری اپنے ساتھ سور پر کارآمد ''ایس جی'' کارتوس بھی رکھیں کیونکہ تیتر پر استعمال ہونیوالے کارتوس چھ اور آٹھ نمبر سور کے لیے بے سود تھے۔ ''کیا ادھر سے سور بھی نکل سکتے ہیں''

اس کے دوست نے گھبرا کر کہا۔

''ہاں ضرور نکلیں گے لیکن تم گھبراؤ نہیں۔ ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں انہیں ہم سے خطرہ

ہے۔''

''لیکن میں نے سنا ہے سور بھی انسان پر حملہ آور ہو جاتا ہے''

"بالکل حملہ آور ہو جاتا ہے اور خاص طور پر جب گھبرایا ہوا ہو تو خطرناک ہوتا ہے کئی دفعہ شکاری اس کے حملے میں جان سے بھی گئے۔"

یار میں باز آیا ایسے شکار سے میں تو گاڑی میں ہی بیٹھتا ہوں''

''گھبراؤ نہیں میں تمھارے بالکل ساتھ رہونگا۔ اگر ہمارے قریب سے سور نکلا تو اسے فوراً ہلاک کر دوں گا۔''

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتا آہستہ آہستہ گندم کے کھیت میں چلنے لگا۔

''اتنی چھوٹی گندم میں تو سور موجود ہو نہیں سکتے اس لیے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ سرکنڈوں میں احتیاط ضروری ہے۔''

شکار میں شریک ایک نوجوان نے اسے گھبرایا دیکھ کر کہا۔

چار بندوقچی تھے اور دس لوگ ہاتھوں میں چھڑی لیے گندم کے پودوں کو ہلاتے جا رہے تھے کہ اگر ان میں تیتر موجود ہیں تو وہ اڑیں۔ سب ایک ترتیب کے ساتھ لائین میں چل رہے تھے۔ کچھ دور ایک دوسرے سے فاصلے پر تینوں کتے اپنی دُمیں تیز تیز ہلاتے منہ کھیت میں ڈالے تیتر کی بو سونگھتے شکاریوں کی لائین سے آگے جا رہے تھے۔

''شکار کے دوران واک کافی لمبی ہو جاتی ہے جو صحت کے لیے بہت اچھی ہے اس کے علاوہ مجھے تو اور کوئی بہتر بات نظر نہیں آتی۔ ایک چھوٹے پرندے کو مار کر کیا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ دوسرے جاندار کی تکلیف دہ موت سے لطف اندوز ہونا کتنا عجیب خیال ہے۔۔۔ جب تم اڑتے تیتر پر فائر کر کے اسے مار گراتے ہو تو کیا تمھارے خیال میں یہ بات کبھی آئی ہے کہ وہ پرندہ گرتے ہوئے کس اندوہ اور درد سے جان دے رہا ہوتا ہے۔''

''یار تم نے فلسفہ میں ڈگری لی ہوئی ہے۔ ہر بات کو منطق کی نظر سے دیکھتے ہو۔ میں نے

فلسفہ میں ایم اے تو نہیں کیا ہوا لیکن پڑھا لکھا تو ہوں۔ یہ انسان کی خون آشام جبلت کی تسکین کا ایک ذریعہ ہے۔ تیتر کو گرتا دیکھ کر جو لطف آتا ہے اس وقت کسی کے ذہن میں اس کی تکلیف کا خیال نہیں آتا۔ تسکین جذبہ ہی ایسا ہے کہ یہ دوسروں کی تکلیف کو محسوس نہیں کرنے دیتا۔ وہ لطف و تسکین کسی قسم کی ہی کیوں نہ ہوں۔ فقط شکار ہی اس کی مثال نہیں۔''

ایک جگہ پر دو کتے نزدیک آ کر زیادہ چوکنے ہو گئے اور تیز تیز سانس لینے لگے۔ ایک شکاری نے سب کو ہوشیار کیا کہ کتے تیتروں کی بو سونگھ چکے ہیں۔ تیار رہیں یہاں سے تیتر اڑنے والے ہیں۔ ابھی اس نے اپنی بات مکمل نہیں کی تھی کہ یکے بعد دیگرے تین تیتر وہاں سے اڑے چاروں بندوقیں فائر ہوئیں۔ دو تیتر کچھ بلندی سے زمیں پر تڑپتے ہوئے گرے اور تیسرا دور تک اڑتا چلا گیا۔ دو ملازموں نے بھاگ کر انہیں پکڑا اور ذبح کر دیا ایک نے تو کوئی حرکت نہ کی لیکن دوسرا بہت تڑپا چھوٹے چھوٹے پنجے چلائے اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ ان کی گردنیں کٹنے پر کسی نے توجہ نہ دی، کسی کو کوئی دکھ نہ ہوا۔ شہر سے آئے اس کے دوست نے تاسف سے سر ہلایا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کا دو تیتروں کے حق میں یہ سب سے بڑا احتجاج تھا۔

کچھ دیر بعد پھر ایک تیتر اڑا اور گرا لیا گیا۔ جب بھی کوئی تیتر شکار ہوتا خوشی اور ولولہ دیکھنے والا ہوتا پھر اگلے تیتر اڑنے اور شکار ہونے تک پچھلے کے مارے جانے پر تبصرہ چلتا۔ شکاری کی مہارت اور نشانے کی تعریف ہوتی۔ اب گندم کے کھیت ختم ہونے والے تھے اور وہ سب سر کنڈوں کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ "یہاں سب ہوشیار ہو جاؤ جہاں گندم ختم ہو رہی ہے۔ یہاں سے تیتر اڑیں گے اور ان کا رخ سرکنڈوں کی جانب ہوگا"۔ اس کی بات صحیح نکلی وہاں سے پانچ تیتر اکٹھے اڑے دو شکار ہو گئے اور تین کچھ دور سرکنڈوں میں اتر گئے۔ یہاں سب چوکنا رہ کر چلیں۔ سرکنڈے کافی گھنے ہیں اور ان میں سور بھی موجود ہیں۔ سب شکاری اپنی ایک جیب میں کم از کم دو ایس.جی کے کارتوس رکھیں اور اگر سور ان کی طرف آئیں تو 6 یا 8 نمبر کے کارتوس کی بجائے ایس.جی کا رتوس استعمال کریں۔ یہ اعلان سنتے ہی اس کا دوست گھبرا کر اس کے نزدیک ہو گیا۔

اب تک وہ تقریباً دس تیتر شکار کر چکے تھے۔

سرکنڈوں میں داخل ہوتے ہی مختلف جگہوں سے کئی بھورے اور کالے تیتر اڑے اور تین شکار ہو گئے۔ اگلے آدھے گھنٹے میں کوئی تیتر نہ ملا۔ اب تیتر ڈھونڈ کر اڑانے کا زیادہ دارومدار کتوں پر تھا کیونکہ درمیانی سائز کی چھڑیاں ہاتھوں میں لیے ملازمین سوروں سے خوف زدہ ہو کر تین یا چار کی ٹولیوں میں ہو گئے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ بندوقچیوں کے نزدیک رہیں جس کے سبب جھاڑیوں کو ہلا کر تیتر اڑانے کا عمل محدود ہو گیا تھا۔ ایک جگہ سے تقریباً چھ یا سات بڑے سائز کے سور خر خر کرتے بھاگے۔ چاروں بندوقیں فائر ہوئیں اور ایک سور جو دوسروں سے پیچھے رہ گیا تھا لڑکھڑا کر گر پڑا۔ شکاریوں کی خوشی دیدنی تھی۔ سب اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ کافی زخمی تھا۔ انتہائی خوفزدگی کے عالم میں آنکھیں گھما کر دیکھ رہا تھا۔ شدت تکلیف سے پچھلی دونوں ٹانگیں زمین پر رگڑ رہا تھا اور چیخیں مار رہا تھا۔ تین آدمیوں کے ہاتھ میں مضبوط لاٹھیاں تھیں۔ انہوں نے سور کے سر اور ٹانگوں پر برسانی شروع کر دیں۔

سور کی درد بھری چیخوں سے اس کے شہری دوست کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ پھر اچانک اس نے اپنے دوست سے وہ ظلم بند کرنے کا کہا اور درخواست کی کہ سور کو لاٹھیوں سے ہلاک کرنے کی بجائے فائر کر کے مار دیا جائے۔ چنانچہ نزدیک سے فائر ہونے کے سبب سناٹا چھا گیا اور سور بالکل ساکت ہو گیا۔

''یہ بڑا ظلم ہے فقط سفاکیت ہے۔ آج کے اتنے ترقی یافتہ اور باشعور زمانے میں دوسرے جاندار کو اتنی تکلیف سے مار کر تسکین اور خوشی حاصل کرنا وحشت کی انتہا ہے۔''

''تم پریشان نہ ہو۔ آج تمھارا پہلا شکار ہے اس لیے تمہیں ایسا لگ رہا ہے جب آئندہ آؤ گے تو یہی ظلم تمہیں مزہ دے گا۔''

''میں زندگی بھر دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروں گا''

''ٹھیک ہے مت آنا لیکن آج تو انجوائے کرو۔ تمھارے علاوہ سب کیسا لطف لے رہے ہیں''

سرکنڈوں کے درمیان میں چند ایکڑ پر گندم کا کھیت تھا اور اس کے کنارے پر ایک چھوٹا سا کچا گھر بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے ٹیوب ویل تھا۔ ان کی تینوں گاڑیاں طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈرائیور اس جگہ لا چکے تھے۔ دن کے تین بجنے والے تھے۔ اس لیے کھانا گرم کیا گیا اور ایک بڑی سی دری بچھا کر کھانا کھایا آدھ گھنٹہ آرام کیا۔

اب ہمارے پاس شکار کے لیے فقط ایک گھنٹہ اور ہے پھر سورج غروب ہونا شروع ہو جائے گا۔ کھانے کے بعد تقریباً گھنٹہ پھر شکار میں چند اور تیتر مارے اور واپسی کا اعلان کیا۔ ملازموں نے کتوں کو پکڑ کر گاڑی میں بٹھا دیا۔ سب لوگ تھکے انداز میں گاڑیوں کی طرف آ رہے تھے کہ ایک جھاڑی میں سے ایک تیتر اڑا۔ سب شکاری اپنی بندوقوں میں سے کارتوس نکال چکے تھے۔ جو سب سے پیچھے چلتا آ رہا تھا اس نے جلدی سے فقط ایک ہی کارتوس گن کی ایک نالی میں ڈالا اور دور ہوتے تیتر کو نشانے میں لے کر بندوق چلا دی۔ تیتر کچھ ڈگمگایا اور نیچے کو گرنے لگا۔

"جلدی کرو! اسے تلاش کرو یہ چھپ جائے گا یا بھاگ جائے گا یہ زیادہ زخمی نہیں ہوا اور اس کے پیر ٹھیک ہوئے تو یہ قابو نہیں آئے گا۔"

اس شکاری کا اندازہ ٹھیک تھا۔ تیتر کی ٹانگیں محفوظ تھیں فقط دایاں پر زخمی ہوا تھا۔ وہ تیتر زور سے زمین پر گرا چند لمحے بے حس پڑا رہا پھر جان بچانے کے جذبے کے تحت اٹھ کر بھاگا اور تقریباً سو فٹ دور ایک گھنی جھاڑی میں گھس کر چھپ گیا۔ چار پانچ آدمی ہاتھوں میں چھڑیاں لیے اسے جھاڑیوں میں تلاش کر رہے تھے

''ایک کتے کو گاڑی سے اتار کر لاؤ وہ اس تیتر کو تلاش کر لے گا''

قدموں کی آواز جھاڑی کے قریب آتی جا رہی تھی۔ تیتر اپنی ساری تکلیف بھول کر سانس روکے زمین کے ساتھ لگ گیا۔ اس کا ننھا سا دل خوف سے بند ہوتا معلوم ہو رہا تھا۔ دو آدمیوں نے اپنی چھڑیاں اس جھاڑی پر ماریں جس میں وہ چھپا ہوا تھا۔ لیکن وہ ہلا تک نہیں۔ مگر جب اسے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اس کی ڈر کے مارے روح فنا ہو گئی۔ اسے موت دبے پاؤں اپنی

طرف بڑھتی محسوس ہونے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جھاڑی میں ہی دبک کر بیٹھا رہے یا کتے کے قریب آنے سے پہلے بھاگ کر کسی اور جھاڑی میں گھس جائے۔ مگر وہ شدید تکلیف میں مبتلا تھا ٹوٹے پر سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔

کتا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ جھاڑی کو سونگھا۔ تیتر کو کتے کا سانس محسوس ہو رہا تھا۔ خوف نے اسے شل کر دیا۔ کتا کھانا کھا چکا تھا اور ویسے بھی دن بھر کے شکار کی مشقت کے بعد سونگھنے کی صلاحیت کمزور پڑ گئی تھی۔ وہ اس جھاڑی سے ہٹ کر دوسری اور پھر اس سے اگلی جھاڑی کے پاس چلا گیا۔

''ڈھونڈو اس ظالم تیتر کو کہاں چھپ گیا ہے ہمارا وقت ضائع کر رہا ہے اس کا پر ٹوٹ گیا ہے زندہ تو وہ رہ نہیں سکتا اگر ہمیں نہ ملا تو رات کو اسے جھاڑی سے کوئی گیدڑ پکڑ کر کھا جائے گا۔''

کچھ دیر وہ تلاش کرتے رہے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

"چلو واپس چلیں ابھی ہم نے گاڑیاں دریا سے بھی گزارنی ہیں اور شام گہری ہونیوالی ہے۔ اس لعنتی تیتر نے ہمارے ساتھ عجب زیادتی کی ہے۔"

گاڑیوں کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتی گم ہوگئی۔ تیتر جھاڑی سے نکل کر اس درخت کی طرف چلا جس پر ان کا گھونسلہ تھا اور وہ سارا خاندان شام کو اکٹھے درخت پر چلے جاتے تھے۔ آج اس سے غلطی ہوئی ماں کے کہنے کے باوجود وہ گندم کے کھیت سے اڑ کر ان کے ساتھ نہ گیا اور شکاری پہنچ گئے۔

اب اس سے مزید چلنا مشکل ہو گیا۔ وہ ایک چھوٹی سے جھاڑی کے نیچے چھپ گیا۔ زخم کی تکلیف سے وہ تڑپنے لگا۔ ایک دم وہ سہم گیا اسے گیدڑ کے قدموں کی چاپ نزدیک آتی محسوس ہوئی اور نزدیک اور نزدیک پھر سانس لینے اور سونگھنے کی آواز۔

گیدڑ تھکا ہوا نہیں تھا اور اس کا پیٹ بھی خالی تھا اور پھر گیدڑ کے نتھنے اس کے زخمی پر کو چھو گئے۔

تربوز والا

جھلسا دینے والی لو چل رہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھی۔ خاص طور پر موٹر سائیکلیں جو شہر کی شاہراہوں پر چیونٹیوں کی طرح کثرت سے آن موجود ہوئیں تھیں۔ چند سال قبل اتنی تعداد میں نہ ہوتی تھیں۔ کچھ وقت اور پیچھے چلے جائیں تو گرم موسم میں جب ہوا کے گرم جھکڑ چلتے تھے سڑکیں سنسان ہو جاتیں۔ بعد دوپہر موٹر سائیکل۔ سائیکل سوار اور گاڑیاں سڑکوں پر نظر آنا شروع ہوتیں لیکن اب تقریباً ہر گاڑی ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ گرمی اور بڑھاتی تو ہین لیکن اندر بیٹھے مسافر کو ٹھنڈی ہوا مل رہی ہوتی ہے۔ یہ تمام سوچتے ہوئے اس نے چھکڑے والے کے پاس آ کر گاڑی روک دی۔ وہ اکثر اسی سے تربوز خریدتا تھا۔ اس جگہ سڑک پر گھنے درختوں کا سایہ تھا۔ وہ درخت بڑی سڑک کے اختتام پر واقع سبزے کی ایک چند فٹ چوڑی پٹی پر اُگے تھے۔ تربوز والا چھکڑا۔ درختوں والی پٹی سے پار چھوٹی سڑک پر کھڑا تھا۔ وہ سڑک جو وہاں بنے گھروں کے سامنے سے گزرتی تھی۔

تربوز بیچنے والا اپنے برابر کھڑی سرخ کار کے اندر بیٹھی دو خواتین سے قیمت فروخت پر کوئی بحث کر رہا تھا اس نے چند لمحے انتظار کیا پھر گاڑی کا ہارن بجا کر اسے متوجہ کیا لیکن وہ جھکا ہوا مسلسل ان سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ گاڑی چلا کر ساتھ ہی کچھ فاصلے پر موجود فروٹ کے اسٹالوں تک جانے کا سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر تربوزوں کے چھکڑے پر لگے ڈھیر کے ساتھ بیٹھے بچے پر پڑی جو یقیناً تربوز والے کا بیٹا تھا۔ وہ لڑکا تقریباً دس سال کا ہوگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بچہ بے چینی سے کبھی باپ کو دیکھتا ہے اور کبھی اس کو۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ بچہ سمجھ گیا ہے کہ یہ گاڑی والا اس کے باپ کا اور زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہتا اور روانہ ہونے کے لیے تیار ہے۔ اس نے

آگے سے تربوز لینے کا ارادہ بدل دیا اور غور سے بچے کو دیکھنے لگا۔ معصوم بھولا بھالا دنیا کے حالات اور نزاکتوں سے بے نیاز تربوز کے ڈھیر سے ٹیک لگائے چھکڑے پر بیٹھا لیکن اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ معصوم اور بھولا تو ہے لیکن دنیا کے حالات سے اس کا کچھ پالا پڑ چکا ہے۔ ان سے وہ اپنے ہم عمر بچوں کی طرح بے نیاز نہیں۔

"صاحب معافی چاہتا ہوں، یہ دونوں بہت کور ذہن عورتیں ہیں، دس بار بھاؤ پوچھیں گی اور جب کچھ خرید لیں گی تو پھر کہیں گی کہ قیمت اور کم کرو۔ یہاں ساتھ والے گھر رہتی ہیں اگر میں ان کی بات نہ مانوں تو دھمکی دیتی ہیں کہ میونسپلٹی والوں کو کہہ کر تمھیں ادھر کھڑا نہیں ہونے دیں گی۔ دونوں بہنیں ہیں اور غیر شادی شدہ ہیں اب ان سے کون شادی کرے گا۔ اچھی خاصی عمر کی ہوگئی ہیں۔" ایک ہی سانس میں اس نے ان کے کوائف بتا دیئے۔ یار چھوڑو ان خواتین کا قصہ تم ہمیں تربوز دو، اس کے دوست نے تربوز والے کو کہا۔ "صاحب آپ کو تو معلوم ہے میں آپ سے قیمت زیادہ وصول نہیں کرتا اور فروٹ بھی ہمیشہ اچھا دیتا ہوں۔ آپ چونکہ میرے مہربان ہیں آپ ہمیشہ مجھ سے ہی تربوز اور آم خریدتے ہیں۔ میں آپ سے پیسے زیادہ نہیں مانگتا کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ بھاؤ تاؤ نہیں کرتے یا مانگی قیمت پر فوراً خرید لیتے ہیں یا دوسری بات کئے بنا گاڑی آگے بڑھا دیتے ہیں اس لیے میں آپ کو بتاتا ہی مناسب ریٹ ہوں۔" وہ کوئی ریٹ بتائے بغیر اپنی اور اس کی تعریف کرتا رہا۔

اب وہ بچہ ان سے لاتعلق سا ہو کر ان چند کوؤں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ جو وہاں کاٹے ہوئے تربوزوں کے چھلکوں کے ساتھ گلے تربوز کے حصے کو مزے لے کر کھا رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر چڑیوں کا ایک جوڑا بیٹھا انہیں تربوز کھاتے حسرت سے دیکھ رہا تھا اور ان کے نزدیک جانے کی جرات نہ کر رہا تھا۔

صاحب آج کچھ فروٹ منڈی تیز تھی۔ تربوز بھی زیادہ نہیں آیا فقط دو ٹرک تربوز کے آئے ہوئے تھے ورنہ معمول کے دنوں میں کم از کم آٹھ دس ٹرک منڈی بکنے آتے ہیں۔ میں آپ کو

تربوز کاٹ کر پہلے چیک کرواؤں گا اگر اچھے اور سرخ ہوئے تو لے جایئے ورنہ میرے، قیمت معمول سے آج کچھ زیادہ ہوگی۔

"ٹھیک ہے تم مجھے تین تربوز اچھے سائز والے دے دو قیمت جو کہو گے ٹھیک ہے لیکن اگر تربوز اندر سے سرخ نہ نکلے تو نہیں لوں گا کیونکہ ایسے تربوز میٹھے نہیں ہوتے۔" اس کا دوست خاموش بیٹھا ساتھ گزرتی ٹریفک انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ تربوز والا چھکڑے کے قریب کھڑا ڈھیر سے تربوز پسند کر رہا تھا۔ اس کا ذہن چھکڑے کے پاس کھڑے تربوز والے سے ہٹ کر تقریباً پچیس سال قبل شہر روم میں واقع کلوزیم اور روما فورم کے درمیان موجود بڑی سڑک پر چلا گیا۔ جہاں ایک خوبصورت اطالوی لڑکی سفید ایپرن باندھے ٹیٹس کے محراب کے سائے میں کھڑی تربوز کے قاشے بیچ رہی تھی۔ اور اس سفید سنگ مرمر یادگاری محراب کے اوپر بے شمار یہودی قیدی دکھائے گئے تھے جنہیں رومن جنرل یروشلیم سے گرفتار کر کے روم لایا تھا۔ اس سنگ مرمر کی سفید یادگاری محراب اور لڑکی کے سفید پیراھن کے درمیان وہ کٹے سرخ تربوز بہت خوش رنگ لگ رہے تھے اس دن روم میں گرمی بھی بہت تھی اور اس نے برف پر ٹھنڈے کیے ہوئے تربوز کے سرخ اور خوش ذائقہ چند ٹکڑے لڑکی سے خرید کر اس کے ساتھ کھڑے ہی کھائے تھے۔ "کیا وقت تھا وہ بھی۔" کون سا وقت جناب، اس کے دوست نے اسے بڑبڑاتے سن کر کہا۔ میں اپنے جوانی کے ایک سیاحتی دورے کو یاد کر رہا تھا۔

تربوز والے نے ایک تربوز منتخب کیا اسے دونوں ہاتھوں سے بجا کر دیکھا اور پھر اللہ کا نام لے کر اسے چھری سے تھوڑا چوکور کٹ لگا کر کٹے حصے کو باہر کی طرف کھینچا ساتھ ہی اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی، کیونکہ تربوز ہلکے گلابی رنگ کا تھا سرخ نہ تھا۔ اس نے اسے ایک طرف کو کر دیا۔ بچہ کوؤں سے نظر ہٹا کر بڑے غور سے تربوز کٹتا دیکھ رہا تھا۔ باپ کے ساتھ اس کے معصوم چہرے پر بھی مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اب وہ بڑے غور سے اپنے باپ کو چھکڑے سے تربوز پسند کرتے دیکھ رہا تھا کبھی کبھی وہ اس کٹے تربوز کو بھی دیکھ لیتا جو اس کی دانست میں ضائع ہو چکا تھا۔ اور اب فقط کوؤں

کی قسمت میں تھا۔ بچے کو اندازہ تھا کہ پھیکی رنگت کا تربوز میٹھا بھی نہیں ہے اور اس کا ذائقہ بھی اچھا نہیں ہوگا۔ وہ گاڑی سے اس بچے کو دیکھ رہا تھا جو پریشان محسوس ہو رہا تھا۔ لڑکا شاید کسی سکول نہیں جاتا ورنہ اس وقت وہ اپنے باپ کے ساتھ تربوز نہ بیچ رہا ہوتا۔ ہوسکتا ہے وہ کسی سکول جاتا ہو اس وقت تو چار بج رہے ہیں۔ سکول کے بعد باپ کا ہاتھ بٹا رہا ہو۔ ہاں ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو۔ "کیا سوچ رہے ہو۔" اس کے دوست نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر کہا۔ اس نے چونک کر دوست کی طرف دیکھا۔ "کچھ خاص نہیں۔ بس سوچ رہا تھا کہ تربوز والے کا بیٹا سکول وغیرہ جاتا ہوگا یا معاشی مجبوریوں کے ہاتھوں یہ ہمارے ملک کے لاکھوں بچوں کی طرح تعلیم سے محروم ہے۔"

اس نے ایک گہرے سبز رنگ کا بڑے سائز کا تربوز ڈھیر سے کافی تلاش کے بعد پسند کر لیا تھا دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کے وزن کو جانچا اور پھر وزن کرنے والے ترازو پر رکھ کر وزن دیکھنے کے بعد ساتھ پڑے کپڑے سے اچھی طرح صاف کیا۔ "صاحب جی یہ انشاءاللہ بہت سرخ اور اچھا ہوگا۔" اس نے تربوز کو کٹ لگانے سے پہلے چھری کو کپڑے سے صاف کیا۔ لڑکا تربوز پر نظر جمائے ہوئے تھا اور اس کے ہونٹ ہلکے ہلکے ہل رہے تھے شاید دعا مانگ رہا تھا۔ وہ مسلسل بچے کو دیکھ رہا تھا جو ہر شے سے بے نیاز تربوز کے کٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ بچے کے چہرے کے تاثرات کو پڑھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کرے گا کہ تربوز صحیح نکلا یا پہلے جیسا بیکار ہے۔ اب وہ تربوز کی بجائے بچے کو دیکھ رہا تھا۔

اچانک بچے کا چہرہ پھیکا پڑ گیا اور وہ گھبرا کر چھکڑے سے اتر کر سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس نے نظریں گھما کر دیکھا تربوز والا ایک ٹکڑا کاٹ کر الگ کئے ہوئے تھا جو اپنی رنگت میں پہلے تربوز جیسا ہی تھا۔ "کوئی بات نہیں یہ اللہ کی مرضی ہے صاحب جی میں آپ کو اور تربوز کاٹ کر دکھاتا ہوں۔" اس نے محسوس کیا کہ وہ کٹا تربوز چھکڑے پر واپس رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ ہلکے کانپ رہے تھے۔ کچھ دیر وہ ساکت کھڑا خالی نظروں سے تربوزوں کو دیکھتا رہا پھر اسی کپڑے کو اٹھا کر ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کیا جس کے ساتھ اس نے تربوز سے گرد کو ہٹایا تھا۔ چند لمبے سانس

لینے کے بعد وہ پھر تربوزوں کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ اب وہ بچہ بھی باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ کچھ تگ و دو کے بعد دونوں نے ایک تربوز منتخب کیا۔ اسے کاٹنے سے پہلے دونوں اس پر نظریں جمائے کھڑے ہو گئے جیسے پرکھ رہے ہوں کہ یہ اندر سے کیسا ہو گا۔ بچہ بہت بے چین اور فکر مند تھا۔ ہراساں، پریشان، مضمحل، تربوز ضائع ہو جانے کا ملال، اس کے انگ انگ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ ”غربت کا ذائقہ اور کاٹ کیا بری شے ہے۔ پیدائش سے موت تک نباہ کرنے کے باوجود اس سے شناسائی کتنی مشکل ہے۔ غریبی زندگی کے رنگ روپ کو کیسے کاٹ کر الگ پھینک دیتی ہے۔ اس بچے کو دیکھو اس عمر میں معاشی مسائل کو سمجھتا ہے تھوڑے سے نقصان سے کیسے پریشان ہو گیا ہے۔“ اس نے اپنے دوست کو مخاطب کیا جو چپ سادھے باپ بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔

تربوز والے نے تربوز پر چھری رکھی اس کے سرخ ہونے کی دعا کی اور اللہ اکبر کہہ کر ایسے چھری اس میں داخل کی جیسے وہ بکرا ذبح کر رہا ہو چند لمحے اس نے چھری کو تربوز کے اندر ہی رہنے دیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ایک جواری تاش پر کافی بڑا داؤ لگا کے بیٹھا ہو اور پتے دکھانے لگا ہو جس کا نتیجہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے بھی دعا کی کہ تربوز اچھا نکلے وہ نہیں چاہتا تھا کہ تربوز والے کا زیادہ نقصان ہو اسے باپ سے زیادہ بیٹے پر ترس آ رہا تھا۔ ”یا اللہ مدد“ کہہ کر اس نے تربوز کا ایک چوکور ٹکڑا باہر نکالا۔ بچے نے گھبرا کر دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ لیئے۔ میری قسمت میں صاحب جی آج آپ کو تربوز بیچنا نہیں لکھا۔ یہ سالا بھی ٹھیک نہیں نکلا۔ بچے کی عجیب حالت تھی جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا یاس رنج یا غصہ اس کی نظریں ان دونوں پر مرکوز تھیں لیکن اس کے دماغ میں کیا خیالات جنم لے رہے ہیں وہ اس کی چہرے پر عیاں ہونے کے باوجود مبہم تھے۔ غیر واضح تھے۔

تینوں کا کتنا وزن بنا اور اگر یہ صحیح اور سرخ ہوتے تو کتنے کے بکتے؟ جناب چار سو روپے کے۔ ٹھیک ہے یہ لو چار سو روپے اور تینوں تربوز گاڑی میں رکھ دو اس نے بٹوے سے پیسے نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ نہیں صاحب یہ مناسب نہیں آپ میرے مہربان ہیں لیکن یہ تربوز میٹھے نہیں اس لیے آپ انہیں لے کر کیا کرینگے۔ کوئی بات نہیں آج مجھے ایسے ہی تربوز چاہییں۔ بچے کا چہرہ

کھل اٹھا وہ حیرت سے آنکھیں مٹکا رہا تھا جیسے اسے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ اس نے جلدی سے تینوں تربوز گاڑی میں رکھ دیئے۔ اس کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شرارت بھری چمک۔ گاڑی اس نے آگے بڑھائی تو اس کا دوست بولا بچے کی مسکراہٹ اور چہرے کے تاثرات میں تمہارے لیے پسندیدگی تھی اور مسکراہٹ سے محسوس ہوتا تھا جیسے تمھاری حماقت پر ہنس رہا ہو۔ "کوئی بات نہیں اس کے چہرے پر مسکراہٹ تو آئی۔"
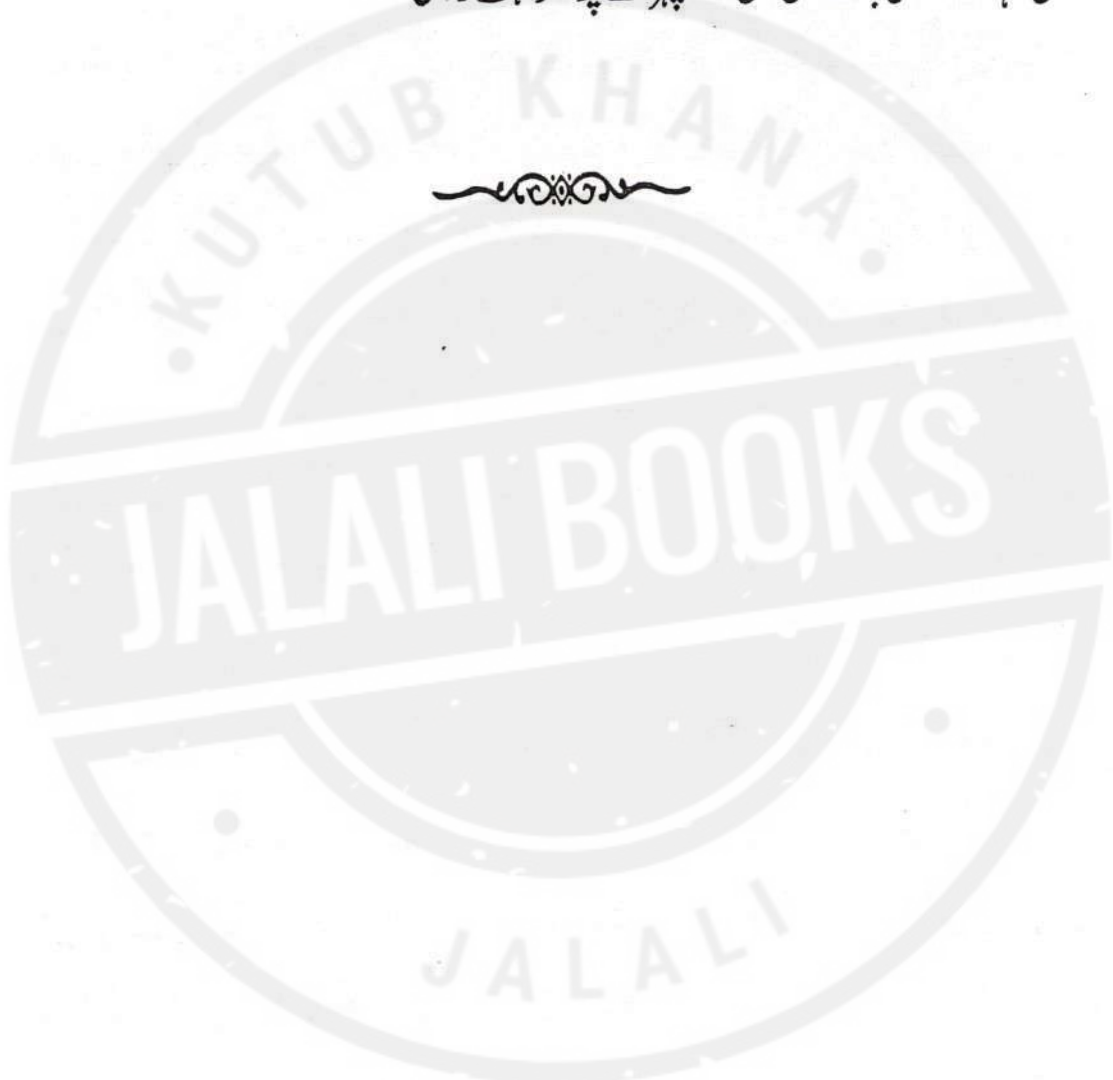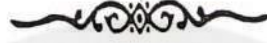
زندگی

گلاب کے پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے وہ اپنے ایک افسرِ اعلیٰ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ تازہ پھولوں کی بھینی بھینی مسحور کن خوشبو وقفے وقفے سے وہ محسوس کر رہا تھا۔ ہال میں تقریباً پچاس کے قریب اس کے ساتھی اور دفتر کے لوگ موجود تھے۔ ایک کنارے پر سموسے، مٹھائی اور چائے ایک بڑے میز پر سجی تھی۔ مقررین اس کی محنت، دیانتداری اور فرض شناسی کی تعریف کر رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ ان باتوں پر غور کرتا جو کہی جا رہی تھی۔ اس کا ذہن آنے والے کل میں الجھا ہوا تھا۔ آج وہ تقریباً چالیس سال سرکاری نوکری کرنے کے بعد ریٹائر ہو رہا تھا۔ چالیس سال قبل وہ ریلوے کے اسی دفتر میں کلرک بھرتی ہوا اور آج سینئر کلرک کے طور پر ملازمت سے فارغ ہو رہا تھا۔ کل ہی تو میں دفتر میں بھرتی ہو کر آیا تھا، اور آج ہار پہن کر بیٹھا ہوں کہ میرا آج اس دفتر میں آخری دن ہے۔ کمال کی بات ہے۔ کیا یہ جادونگری ہے جس نے کچھ دیکھنے ہی نہ دیا کچھ محسوس ہی نہ ہوا۔ بس وقت گزر گیا جسم خستہ ہو گیا۔ سب گزر گیا جیسے کسی اسٹیشن پر سوئے ہوئے مسافر کے قریب سے ٹرین بنا رکے زناٹے سے گزر جائے۔ تقاریر ختم ہوئیں، چائے پی گئی، جذباتی انداز میں اس کے پرانے دوست اور ساتھی اس سے گلے ملے اور اسے دفتر کے گیٹ تک چھوڑنے آئے اور وہ تھکے قدموں سے اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔

آج وہ اپنے سائیکل پر دفتر نہیں آیا تھا بلکہ اس کا ایک ہم سایہ موٹر سائیکل پر اسے دفتر چھوڑ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ گھر کی جانب پیدل چلتا رہا۔ سوچوں کا ایک سیلاب تھا جو اس کے ذہن میں رواں تھا۔ ایک لہر کے بعد دوسری، ایک موج سے بلند دوسری موج۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ موسم بہت گرم ہے وہ ایک درخت کے نیچے دم لینے کو رک گیا، لیکن ذہنی کشمکش جاری رہی۔ آہستہ

چلتے ایک رکشے کو اس نے رکنے کا اشارہ کیا اور اس پر بیٹھ کر اپنے گھر والی تنگ گلی کے نزدیک اتر گیا۔ اسے گھر کی طرف جاتے ہوئے ایسے محسوس ہوا کہ گلی سے گرمی کے سبب ہوا گھبرا کر کسی ٹھنڈی جگہ پناہ لینے چلی گئی ہے۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ جسم تنور کی مانند تپتا محسوس ہونے لگا۔ گھر پہنچ کر اس نے دو لفافے اپنی بیوی کے حوالے کیے جن میں سے ایک میں دو تولیے اور دوسرے میں جائے نماز اور ایک ٹوپی تھی۔

اس کے تینوں بچے گھر پر تھے۔ انہوں نے باپ کو خوش آمدید کہا اور ایک چھوٹا سا پھولوں کا گلدستہ دیا۔ ساتھ ہی باپ کو باعزت ریٹائر ہونے کی مبارکباد دی۔ وہ بے دلی سے مسکرا دیا۔ شام کے وقت دونوں میاں بیوی اکیلے بیٹھے تھے۔

''آپ نوکری سے فارغ ہونے پر فکر مند اور آزردہ محسوس ہوتے ہیں، ہر ملازم نے ریٹائر ہونا ہوتا ہے۔ اس میں پریشانی والی کیا بات ہے'' اس کی بیوی نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ایک کام چھوڑنے پر انسان اس وقت اطمینان سے رہتا ہے جب اسے بہتر نعم البدل مل جائے، اور اگر ہاتھ اور سوچ میں کچھ نہ ہو تو پریشانی تو گھر بناتی ہی ہے۔''

''اللہ کوئی سبب بنائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں'' اس کی بیوی نے اسے پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔ میری کوشش ہے ہمارا مکان مکمل ہو جائے۔ شکر ہے حکومت کی طرف سے پانچ مرلہ زمین کالونی میں سستے داموں مل گئی تھی۔ اب پنشن کی جو یکمشت رقم ملے گی اس سے گھر مکمل ہو جائے گا۔ کوشش کروں گا کہیں مجھے کوئی ملازمت مل جائے ابھی صحت ٹھیک ہے اور دوسرا کوئی اور ذریعہ آمدنی بھی تو نہیں۔''

اللہ کرے گا ہمارے بیٹے کو کوئی نوکری مل جائے گی پھر آپ کو محنت کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

''ہاں! خدا کرے اسے کوئی ملازمت مل جائے تب مجھے اطمینان ہو جائے گا اصل میں

چالیس سال دفتر میں کام کیا ہے اب ایک دم گھر میں کیسے بیٹھ جاؤں۔ تمہیں کیا بتاؤں ریٹائرمنٹ کتنا ڈراؤنا خواب ہے۔ بالکل ایسے جیسے نصف موت''۔ ''چھوڑیں اس بات کو۔ آپ بھی عجیب سوچتے ہیں''۔ تقریباً ایک ہفتہ دوست اور رشتہ دار اُسے ملنے آتے رہے اور اکثر گھر پر ہی ہوتا۔ پھر اس نے اپنی اور بیٹے کی ملازمت ڈھونڈنے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ وہ روز صبح گھر سے نکل جاتا اور شام ڈھلے مضمحل اور مایوس واپس آتا۔

اس کا بڑا بیٹا معاشیات میں ایم اے کر چکا تھا۔ اور کئی مہینوں سے روزگار کی تلاش میں تھا۔ وہ لائق، اور خوش شکل تھا۔ شائستہ اور خوش گفتار بھی تھا۔ ذہانت پیشانی سے ٹپکتی۔ مگر ملک کے معاشی حالات بے روزگاری کی افزائش کا سبب تھے۔ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کے لئے پریشان تھے۔ باپ بیٹے کو اپنے پیروں پر کھڑے دیکھنا چاہتا تھا۔ بیٹے کی خواہش تھی کہ باپ کی عمر آرام کرنے کی ہے اسے آرام کرنا چاہیے۔ لیکن کیسے؟ دونوں کے پاس اس کا کوئی حل نہ تھا۔

اسے سائیکل پر پھل رکھ کر بیچتے تقریباً ایک سال ہونے کو آیا تھا، لیکن اس کے گھر والوں کو معلوم نہ تھا۔ گھر والوں کو اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک فیکٹری میں اسٹور کا انچارج ہے۔ روزانہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر گھر سے علی الصبح نکلتا اور سیدھا دوست کے گھر آتا۔ ایک کپ چائے اس کے ساتھ بیٹھ کر پیتا اور پھر اپنا صاف لباس اتار کر دوسرا لباس پہن لیتا۔ اس لباس کو وہ پھل فروخت کرنے کے لیے استعمال کرتا۔ ہفتے میں ایک دفعہ اس کے دوست کی بیوی اس لباس کو دھو دیتی۔ نیا سائیکل وہیں چھوڑتا اور وہ سائیکل لے لیتا جس کے پیچھے اس نے بڑی سی چھابڑی لگوا رکھی تھی۔ فروٹ منڈی سے پھل خریدتا اور شام ڈھلے تک اس جگہ پھل بیچتا جو اس کے گھر سے تقریباً سات کلومیٹر دور تھی۔ پھل فروخت کرنے سے حاصل ہونیوالی ماہانہ آمدنی اس کی پنشن سے تقریباً دوگنا تھی۔ لیکن اسے ہر وقت کھٹکا لگا رہتا کہ کہیں اس کا بیٹا یا اس کا کوئی دوست اسے چھابڑی پر پھل بیچتے نہ دیکھ لے۔ وہ گھر جانے سے قبل اپنے دوست کے ہاں غسل کر کے پرانے کپڑے اتارتا اور دوسری سائیکل لے کر گھر چلا جاتا۔

سائیکل پر پھل بیچنے کا مشورہ اسی دوست نے دیا تھا کیونکہ وہ خود بھی یہی کرتا تھا،لیکن وہ کسی خوف یا جھجک کے بنا ایسا کرتا تھا۔ایک دن اس کے دوست نے اسے سمجھایا کہ محنت کرنے میں شرمندگی کیسی۔پھل بیچنے میں کیا قباحت ہے۔میں محسوس کرتا ہوں تم ہراساں اور پریشان ہوتے ہو پھل بیچتے ہوئے۔

''مجھے کوئی خفت نہیں ہوتی،صرف اپنے بچوں کی فکر ہے۔میں نہیں چاہتا کہ ان کے ذہن میں آئے کہ بوڑھا باپ گلی گلی پھر کر پھل بیچتا ہے تا کہ ان کا پیٹ پال سکے۔میرا چھوٹا بیٹا اور بیٹی ابھی پڑھتے ہیں۔بڑا بیٹا تعلیم مکمل کر کے تقریباً سال بھر سے ملازمت کے لیے کوشاں ہے۔ماشا اللہ بہت قابل اور لائق ہے،لیکن شاید لیاقت ہی کافی نہیں ہوتی ملازمت حاصل کرنے کے لیے۔''

''میرا بیٹا بہت حساس ہے۔نوکری نہ ملنے سے اس کے دل پر جو گزر رہی ہے میں جانتا ہوں۔تم بھی دعا کرو اسے کوئی اچھی ملازمت مل جائے۔''

''فکر نہ کرو اللہ نے چاہا تو جلد اسے اچھی ملازمت مل جائے گی۔''

''روزانہ اخبار میں بے روزگار نوجوانوں کی خودکشیوں کی خبریں پڑھ کر دل بیٹھنے لگتا ہے۔دماغ میں وسوسوں کی آندھیاں چلتی ہیں۔برے خیالات بگولوں کی طرح ذہن کو چکر دیتے اپنے دوش لیے جاتے ہیں۔تمہیں اندازہ ہوگا کہ اچھے خیال کو پکڑ کر دماغ میں بٹھانا پڑتا ہے اور برا خیال جان نہیں چھوڑتا۔جیسے ہی جھٹکا دوبارہ آن وارد ہوتا ہے۔ذرا سوچو کہ جن والدین کے جوان بیٹے بے روزگاری کے ہاتھوں اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں،وہ بوڑھے کیسے ضمیر کی کسک اور غم واندوہ کی صیقل شمشیر کے گھاؤ برداشت کرتے ہوں گے۔جب وہ سوچتے ہوں گے کہ ان کا بیٹا ان کی ضروریات کو پورا نہ کرنے کی ندامت اور پشیمانی میں زندگی سے منہ موڑ گیا تو وہ ماں باپ زندگی کے باقی دنوں سے کیسے نباہ کرتے ہوں گے؟''

کافی دیر خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو پریشان نظروں سے تکتے رہے۔

''میں چائے بنا کر لاتا ہوں''

اس کے دوست نے فکر واندوہ کے حصار کوتوڑنے کے لیے کہا اور پھر اٹھ کر چائے بنانے چھوٹے سے برآمدے سے اٹھ کر باورچی خانے چلا گیا۔

ہفتے میں ایک دن وہ پھل بیچنے نہ جاتا۔ سارا دن اپنے پرانے دفتر گذارتا افسران سے منت سماجت کرتا، جن کے ماتحت اس نے کام کیا تھا۔ ان کے گھر پھل لے جاتا اور اپنے بیٹے کی ملازمت کے سلسلے میں درخواست کرتا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے اس کے خوف اور فکر میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس لیے شام کو بیٹے سے خوش دلی سے پیش آتا، اس کا حوصلہ بڑھاتا اور باتوں میں ظاہر کرتا کہ اسے بیٹے کی بے روزگاری کی کوئی فکر نہیں۔ وہ سارا الزام حکومتی بندوبست پر دھرتا جس کے سبب ملک میں لائق اور ہونہار جوان فارغ بیٹھے ہیں۔ بیٹے کی ضروریات کا بہت خیال رکھتا۔ ایک رات کھانا کھاتے ہوئے وہ اپنی بیوی سے ناراض ہو گیا۔ جس نے بیٹے کو کھانا دیتے ہوئے پرانے ٹرے میں سبزی کی پلیٹ کے ساتھ دو روٹیاں کسی کپڑے میں لپیٹے بغیر رکھ دی تھیں۔ سونے سے قبل اس نے اپنی زوجہ کو بڑے رازدارانہ انداز میں سمجھایا تھا کہ بیٹے سے بے اعتنائی کسی ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔ ایک دن منڈی جاتے ہوئے اسے پریشان دیکھ کر دوست نے مشورہ دیا کہ اگر بیٹے کو کوئی مناسب نوکری نہیں مل رہی تو اسے کوئی چھوٹی سی پھل کی دکان بنا دے۔ اس بات پر وہ بہت خفا ہوا اور دوست کو آئندہ ایسی فضول تجویز دینے سے منع کر دیا۔

''میں اپنے ہونہار فرزند کو ایک بڑا آدمی دیکھنا چاہتا ہوں۔ پھل فروش نہیں۔ کیا نسل در نسل غربت ہی ہمارا مقدر رہے۔ مجھے امید ہے خدا ہمارے دن ضرور پھیرے گا۔''

ایک دن صبح منڈی جانے کے لیے دوست کے گھر آیا تو اسے دیکھ کر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کرنے کی بجائے زمین پر لٹا دی اور دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ فرطِ مسرت سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کو نوکری مل جانے کی خبر اسے خبر سنائی۔

''میری بہت بڑی مشکل حل ہو گئی ہے۔ اللہ نے مجھ غریب پر بہت بڑا کرم کیا۔ میرے

دل و دماغ پر چھایا خوف اور دہشت کا گہرا سایہ اچانک چھٹ گیا۔ اب مجھے روشن اور صاف آسمان نظر آ رہا ہے۔ دل پر رکھا بھاری پتھر ہٹ گیا ہے۔''

اس نے اطمینان کی لمبی سانس لی اور پھر ہاتھ میں پکڑا مٹھائی کا ڈبہ اپنے دوست کو پکڑا دیا۔

''جلدی سے مابدولت کو چائے پیش کرو اور پھر منڈی چلیں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ میں پھر سے جوان ہو گیا ہوں اور میری توانائیاں لوٹ آئی ہیں۔''

اس نے پر مسرت لہجے میں دوست سے کہا جو مٹھائی ایک بوسیدہ سی میز پر رکھ رہا تھا۔

جس دن اس کے بیٹے نے دفتر جانا شروع کرنا تھا اس سے ایک دن قبل وہ بیٹے کو ساتھ لیے دن بھر بازار میں پھرتا رہا۔ اسے دو پتلونیں اور تین نئی قمیضیں لے کر دیں۔ جوتے اور چند جوڑے جرابوں کے خریدے۔ بیٹے کے منع کرنے کے باوجود ایک سرخ رنگ کی ٹائی بھی خریدی اور سرشاری سے بتایا کہ اسے ٹائی باندھ کر دفتروں میں جاتے نوجوان بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرا یہ خواب تھا کہ کبھی وہ دن آئے گا جب تمہیں کسی دفتر میں نوکری مل جائے گی اور تم ٹائی لگا کر دفتر جایا کرو گے۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم دفتر ٹائی کے بغیر جایا کرو۔

''تمہاری کبھی کوئی شدید آرزو ایسی بھی تھی جو پوری ہو گئی ہو؟'' ایک دن اس نے دوست سے پوچھا۔

''شدید خواہش جو پوری بھی ہو گئی ہو؟ مجھے یاد نہیں آ رہا، لیکن ہم دونوں غریب لوگ ہیں اور غریب ہوتے ہی وہ ہیں جن کی آرزوئیں تکمیل کا مزہ کم ہی چکھتی ہیں۔ غریبی اور تکمیلِ آرزو بات کچھ بنتی نہیں۔'' ''تم پڑھے لکھے تو نہیں مگر بات تم نے بڑی سمجھ داری والی کی ہے'' ''پڑھا ہوا کیوں نہیں۔ آٹھویں جماعت تک تو ہم دونوں ہم جماعت رہے۔ وہ الگ بات ہے میں مزید تعلیم حاصل نہ کر سکا اور تم پڑھ لکھ کر کلرک بن گئے۔ تمہیں یاد ہو گا ہمارے اردو کے استاد تھے ماسٹر کریم صاحب۔ جو مرغا بنا کر سبق یاد کرواتے تھے اور فارسی کے کسی حافظ صاحب کے شعر اور سعدی شیرازی کی حکایتیں یاد کرایا کرتے تھے۔ مجھے اب بھی بہت سی حکایتیں اور فارسی کے شعر یاد

ہیں۔تم سے تو میرے امتحانات میں نمبر ہمیشہ زیادہ ہوتے تھے۔وہ تو میری قسمت بری نکلی بچپن میں ہی، میرے والد کا انتقال ہو گیا۔میرے ناتواں کندھوں پر بوجھ آن پڑا جس کے نتیجے میں آج بڑھاپے تک دبا ہوا ہوں۔نہ بچپن کا مزا لے سکا نہ جوانی کو محسوس کر پایا ہر وقت بھوک کے ظالم پنجے سے بچنے کی کوشش کرتے کرتے قبر کے نزدیک آ گیا۔بہر حال اللہ کا شکر ہے۔"

جنوری کی ایک صبح وہ اپنے دوست کے ہمراہ پھل خریدنے منڈی کی طرف روانہ ہوا۔موسم بڑا خوشگوار تھا۔سردی کی شدت جو کئی دنوں سے برقرار تھی آج اچانک غائب تھی۔خنک ہوا بھلی لگ رہی تھی۔

"آج مرکزی فروٹ منڈی چلتے ہیں، مجھے کل ایک واقف کار بتا رہا تھا کہ وہاں آج کل قیمتیں نسبتاً کم ہیں اور فاصلہ فقط تین کلومیٹر زیادہ ہوگا۔"

بہتر خیال ہے آج ادھر ہی چلتے ہیں

"آج کا دن نیک اور اچھا لگتا ہے۔فروٹ اچھی کوالٹی کا اور سستا مل گیا ہے۔انشا اللہ آج منافع اچھا مل جائے گا"۔اس نے اپنے پیچھے آتے دوست کو گردن پھیر کر کہا۔اس کی گردن پتھر کی ہو گئی۔بالکل شل،اس کا بیٹا شلوار قمیض پہنے سائیکل کے پیچھے پھل رکھے ایک گلی کی جانب جا رہا تھا۔اس کا دل رک کر تیز دھڑکا۔آنکھوں کے سامنے سائے لہرانے لگے،سائیکل ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر گر گئی۔سارے پھل بکھر گئے۔اس کے دوست نے جلدی سے اپنا سائیکل رکھا اور اسے پکڑ کر فٹ پاتھ کے کنارے بٹھا دیا۔چند راہگیروں کے ساتھ مل کر گرے پھل سمیٹے ایک دکان سے پانی کا گلاس لے کر اسے پلایا اور متفکر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"اٹھو چلیں۔اب میں ٹھیک ہوں۔بس سر چکرا گیا تھا۔فکر والی کوئی بات نہیں" دوست کے کئی سوالات کرنے کے باوجود اس نے سائیکل ہاتھ سے چھوٹ کر گرنے کی وجہ نہ بتائی۔

گھر پہنچ کر وہ ہراساں، مضمحل، بے بس اور بکھرا ہوا شخص لگ رہا تھا۔مایوسی اور غصے نے اس کے خدوخال کو بے ترتیب کر دیا تھا۔

''اس نے مجھے دھوکا دیا، میرے ارمانوں کا خون کر دیا، میرے روشن خواب اس نے بجھا دیئے، نالائق، بے کار، بے روزگار، اسے میں اپنے گھر میں نہیں رہنے دونگا۔ میری طرف سے چاہے جہنم میں جائے''

شام ڈھلے دروازہ کھلا اس کا خوبرو بیٹا صاف ستھرا لباس پہنے سرخ ٹائی لگائے، باپ کے خیالات سے بے خبر مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

بیٹے کے سلام کرنے پر وہ اپنے غصے سے بے قابو ہونے ہی والا تھا کہ اچانک کئی خیال اس کے ذہن میں بگولے کی مانند گھومے۔ بے روزگار نوجوانوں کی شکست خوردگی کے۔ خدا نہ کرے کبھی ایسا وقت آئے، وہ دل ہی دل میں بولا۔ پھر وہ روح کی میسر توانائی کو مجتمع کر کے ہلکا مسکرا کر بولا۔ ''خدا تمہیں ہمیشہ سلامت رکھے''۔

عفریت

المعتمد نے پہلو میں پڑے چوکور میز سے بلورین گلاس اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے کے بعد اسے واپس رکھ کر ساتھ پڑے خوان سے چند انگور لیے، اور اس آسمانی رنگ کے قالین کے چوکور اور تکونی شکل کے ڈبوں کو غور سے دیکھنے لگا جس پر وہ اندلس کے کئی آئے ہوئے وفود کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مختلف ریاستوں کے ایلچی اور وزراء کے ہمراہ آئے ہوئے علما بھی بڑے ہال میں موجود تھے۔ گرمی ہونے کے سبب ٹھنڈے مشروبات کی صراحیاں جا بجا رکھی تھیں۔ بلور کے علاوہ گلاس خاص سونے اور چاندی کے بھی تھے۔ انتہائی اہم مسئلہ درپیش تھا۔ زندگی اور موت کا مسئلہ، بقا اور فنا کا سودا۔ کئی دنوں سے کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی تھی۔

''حضور! میری بات غور سے سنئے۔ 1031ء میں اندلس سے اموی حکومت کا کلی خاتمہ ہو گیا اور اسلامی ریاست اکیس چھوٹی بڑی ریاستوں میں بٹ گئی۔ اللہ کے فضل سے آپ اندلس میں سب سے بڑی ریاست کے حکمران ہیں''۔ اشبلیہ کے قاضی نے خوشامندانہ، اپنے حاکم المعتمد سے کہا۔ ''یہ مالک کا مجھ گناہ گار پر بہت کرم ہے۔ میں جبل الطارق سے لے کر قرطبہ بلکہ اس سے بھی اگلے علاقوں کا مالک ہوں۔ جہاں آپ سب موجود ہیں یہ شہر اشبلیہ اس وقت ہسپانیہ کا سب سے امیر اور ترقی یافتہ شہر ہے۔ میری سلطنت میں المریہ جیسا بڑا تجارتی شہر بھی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود میری حالت یہ ہے کہ الفانسو ششم کے مطالبے پر مجھے اپنی باحیا اور نیک سیرت دختر اس کافر اور حرام خور کے حرم کے لیے بھیجنی پڑی۔ ہر سال پچاس ہزار سونے کی اشرفیاں اسے خراج میں دینی پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار دیگر قیمتی تحائف''۔ ''ہم اُسے سالانہ تیس ہزار سونے کے سکے پیش کرتے ہیں''۔ غرناطہ کے حاکم عبداللہ کے نمائندے نے کہا۔

''پورے ملک ہسپانیہ کی ایک بھی مسلمان ریاست نہیں، جو کسی نہ کسی عیسائی ریاست کی باج گزار نہ ہو۔ کوئی قشتالیہ کی کوئی اراگون یا نوار کی کوئی کیٹیلونیا اور استورقہ کی۔ ہم سب مسلمان حاکم اپنی عوام کا خون نچوڑ کر ان کافروں کے خزانے بھر رہے ہیں۔ ہماری تجارت وصنعت وزراعت تباہ حال ہو چکی ہے۔ افواج بددل ہیں۔ انہیں معقول تنخواہ دینے کے لیے ہمارے پاس وسائل نہیں بچتے۔ ہم تمام ریاستیں مل کر اکیلے الفانسو کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اندلس کا کون سا علاقہ ہے جو اس کے شر اور اس کے گھوڑوں کے سموں سے محفوظ ہے، شاید کوئی بھی نہیں''۔

ایک بات کو آپ تمام حضرات ذہن میں رکھیں کہ جب کبھی بھی اور جب بھی انہیں موقعہ ملے گا۔ خدا نہ کرے وہ وقت میری زندگی میں آئے۔ عیسائی جب بھی ہمارے علاقوں کو فتح کر لیں گے پھر وہ مسلمانوں کو افریقہ میں دھکیل دیں گے یا سب رہ جانے والوں کو بزور شمشیر عیسائی بنا دینگے۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں ایسے بھیانک وقت سے۔ قاضی غرناطہ نے کہا۔ قاضی اپنی ریاست کے وفد کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ مختلف ریاستوں کے حکمرانوں اور وزرا میں اختلافات تھے۔ قاضی اور علما وہ جس ریاست سے بھی آئے تھے وہ اتفاق کرتے تھے اس بات پر کہ افریقہ سے نئی ابھرتی طاقت کی مدد حاصل کی جائے۔ وہ لوگ المرابطین کہلواتے تھے وہ سخت گیر اور مذہب پر جان چھڑکنے والے بربر تھے اور ان کا سردار اور حکمران یوسف بن تاشفین تھا۔ روسا اندلس کا خیال تھا کہ افریقی بربروں کو نہ بلایا جائے وہ سخت گیر، وحشی جنگجو، مذہبی جنونی، اندلس کی اعتدال پسند، نرم خو مذہبی رویوں کو برداشت نہیں کریں گے اور دوسرا ان بھک منگوں نے جب ہسپانیہ کی زرخیزی، انسانی خوبصورتی، محلات، حویلیاں، موسم کی شادمانیاں دیکھیں تو کبھی واپس نہیں جائیں گے۔ ایسے میں تمام حکمران اپنی ریاستوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ کافی عرصے سے اندلسی مسلمان عیسائی حکمرانوں کو سونا چاندی اور دیگر قیمتی تحائف دے کر اپنی حکمرانیاں بچائے ہوئے ہیں اور انہیں آئندہ بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔

لیکن المعتمد اور علمانے اس پر اتفاق نہ کیا۔ المعتمد نے کہا'' غلامی اب ہمارا مقصد ہو چکی ہے

وہ افریقی بربروں کی ہو یا عیسائیوں کی، لیکن میں ذاتی طور پر یہ پسند کروں گا کہ افریقہ میں مسلمانوں کے اونٹ چراتا پھروں بجائے قشتالیہ میں عیسائیوں کے سور چراؤں۔ معزز حاضرین دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا ہے کچھ دیر کے لیے اس بحث کو روکتے ہیں کھانے کے بعد آپ حضرات کچھ آرام فرمائیں۔ انشاء اللہ شام کو دوبارہ ملتے ہیں۔ آج ویسے بھی گرم دن ہے شام کو اشبیلیہ میں اکثر ہوا معتدل ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں دل و دماغ بہتر حالت میں ہوگا کہ صحیح فیصلے پر پہنچا جائے''۔ اپنے محل کے اندرونی حصے کی طرف جاتے ہوئے معتمد نے غلاموں کو مہمانوں کے لیے کھانا لگانے اوران کی جملہ ضروریات کا خیال رکھنے کے متعلق ہدایات دیں۔

بعد دوپہر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ نہا کر تازہ دم ہو گیا محل کی دوسری منزل کی ایک بالکونی میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے بہتے دریائے الکبیر کا پانی زیادہ گدلا نہیں تھا جس سے اس نے اندازہ لگایا کہ قرطبہ کے میدانوں اور اوپر پہاڑی علاقوں میں کافی دنوں سے بارش نہیں برسی۔

ہوا میں تازگی اور ہلکی ٹھنڈک تھی۔ دریا کے کنارے پر بندھی کشتیوں میں ایک کشتی کا بادبان پوری طرح نہیں لپیٹا گیا تھا جس کے سبب نسبتاً تیز چلتی ہوا میں وہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اوراس کی وجہ سے وہ کشتی ہچکولے کھا رہی تھی۔ ملکہ اعتماد جب بالکونی میں داخل ہوئی وہ اسی پھڑ پھڑاتے بادباں کو دیکھ رہا تھا۔ بالکونی پر ریشم کا بہت باریک اور نفیس ہلکے سبز رنگ کا پردہ لٹک رہا تھا، لیکن وہ اتنا باریک تھا کہ اس سے پار دریا کا نظارہ دھندلا یا نہیں تھا۔ ملکہ نے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر پیار سے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے ہلکے سے گردن گھما کر اسے مسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر ساتھ رکھی کرسی پر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ملکہ اعتماد نے بیٹھنے کے بعد بڑے ناز سے دو شعر کہے جس کا مفہوم تھا ''میرے جسم وجان کا مالک آج اداس اور بجھا بجھا ہے، کاش میں اس کے دل کے الاؤ کو تیز کر سکوں۔ جس سے اس کا چہرہ بھی خوشی سے تمتما اٹھے'' المعتمد نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے داد دی۔

"تمھیں تو معلوم ہوگا کہ ہماری سلطنت کے بیشتر فقہا اور قاضی تمھارے حق میں نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تمھاری شاعری نے مجھے حکومت سے غافل کر رکھا ہے اور میں اپنا بیشتر وقت شعر و شاعری کرتے اور مشاعروں کی نذر کر دیتا ہوں۔ انہیں کیا معلوم میں تمھارے سبب حکومت سے ہی غافل نہیں دنیا و مافیہ سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ تمھاری محبت کی گھٹا، اداؤں کی پھوار، اور شاعری میں قوس وقزاع کے جو رنگ ہیں وہ میری روح کو ہر لمحے نہال کیے رکھتے ہیں۔ ایک خوشبو اور لطافت کا حصار ہے جو مجھے دیکھنے اور سمجھنے نہیں دیتا ہر طرف مجھے فقط تم ہی نظر آتی ہو"۔ "عالم پناہ پھر تو فقہا صحیح مجھے قصوروار سمجھتے ہیں۔ ملکہ ایک ادا سے مسکرا کر بولی۔" "وہ سو فیصد درست ہیں"۔ وہ خاموش ہو کر کشتی کے بادبان کو دیکھنے لگا۔ "شاہِ اندلس آج آپ اداس ہیں، فکرمند اور مضطرب ہیں، آپ کی خالی نظریں آپ کی پریشانی کو بیان کر رہی ہیں۔

"ہاں جانِ معتمد تم ٹھیک کہتی ہو۔ مس پریشان اور تشویش میں مبتلا ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کروں، لیکن اس پر بات بعد میں کرتے ہیں۔ تم مجھے اپنے ہاتھ سے المریہ کی سرخ شراب کے چند جام پلا دو تاکہ دل دماغ پر چھایا غبار کچھ چھٹ جائے"۔

کچھ دیر بعد دو پری چہرہ کنیزیں ملکہ کے پیچھے چلتی اس بالکونی میں داخل ہوئیں ایک نے خوبصورت شیشے کی صراحی تھام رکھی تھی اور دوسری کے ہاتھ میں ایک خوان تھا جس میں ایک پتلا طلائی گلاس، جس کے پیندے کے ساتھ زمرے اور یاقوت جڑے ہوئے تھے اور ساتھ دو سونے کی تشتریوں میں بادام، انجیر اور اخروٹ تھے، المعتمد کے سامنے رکھے میز پر رکھ دیئے۔ صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد ملکہ اعتبار نے دونوں کنیزوں کو رخصت کر دیا۔ ایک جام اور کچھ بھنے ہوئے بادام اور کچے اخروٹ کھانے کے بعد کچھ طبیعت بحال ہوئی۔ سورج ترچھا ہو چکا تھا اور اس کی کرنیں دریا کی لہر لہر سے منعکس ہو رہی تھیں دوسرا جام ختم کرنے کے بعد اس نے ہونٹوں کو چوستے ہوئے تیسرا جام بھرنے کی فرمائش کی اور وہ تشویش اور اضطرابی کیفیت سے باہر آ چکا تھا۔ وہ بڑی حد تک اس درد سے آزاد ہو چکا تھا کہ مسلمانانِ ہسپانیہ کی کشتی بیچ منجدھار پھنسی ہوئی ہے اور کوئی

کوشش کرنے والا کوئی حل تلاش کرنے والا معلوم نہیں، اور طاقتور عیسائی حکمران ہر سال زیادہ خراج کا مطالبہ کرر ہے ہیں۔ المعتمد کئی سال سے ایسا ہی کرتا، جب پریشانی اور غیر یقینی بڑھتی وہ المریہ کی شراب کا سہارا ڈھونڈتا جس سے چند گھنٹے فکروں سے نجات مل جاتی۔ ملاگا اور سرقسطہ کی شرابیں بھی اسے پسند تھیں لیکن وہ المریہ کی سرخ شراب جیسی نہ تھیں۔ اب اسے بالکونی سے باہر کا نظارہ حسین لگنے لگا۔ وہاں آتے جاتے مرد وزن سب مطمئن پر آسائش تھے، خوش حال، محفوظ پناہ پائے ہوئے۔ اب کوئی دشمن کوئی حریف عیسائی حکمران اس کے مدِ مقابل نہ تھا سب اس کی جوتی کی نوک پر تھے۔ وہ سب سے مضبوط سب سے بلند حوصلہ مردِ میدان، بلا کا تیغ زن، عالی دماغ اور بیدار بخت حکمران تھا۔

اس نے ملکہ کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا تمہیں یاد ہے وہ دن، جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لمحہ میں کیسے بھلا سکتی ہوں۔ اس لمحے نے تو میری تقدیر بدل کے رکھ دی۔ ایک خچر چرانے والی کنیز ''رمیکیہ'' اندلس کی سب سے بڑی اور امیر ریاست کی ملکہ بن گئی ''ملکہ اعتماد''۔ ''تمھیں شاید یاد ہو وہ اوائیل موسم سرما کی ایک خوشگوار شام تھی۔ ابھی سورج پورا غروب نہ ہوا تھا۔ میں اور ابن عامر بھیس بدل کر ''چاندی والے چوک'' جا رہے تھے تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ دریا کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی۔ ہوا اس دن معمول سے تیز تھی اس لیے دریا میں ہلکی لہریں بن رہی تھیں اور میں نے لہروں کو دیکھ کر ایک مصرعہ کہا تھا''۔

''ہوا کے جھونکوں سے پانی کی موجیں زرہ بن گئی ہیں''

''میں نے ابن عمار کو دوسرا مصرعہ کہنے کی دعوت دی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ تم نے پیچھے سے کہا تھا۔

''لڑنے والے کے لیے کیا اچھی زرہ بنے اگر پانی کی موجین برف بن جائیں''۔ میں حیران رہ گیا تھا تمھاری شعری دسترس پر کہ ابن عمار جیسا سلطنت کا بہترین شاعر سوچتا رہ گیا اور تم نے شعر مکمل کر دیا اور پھر جب میں نے پلٹ کر تمھیں دیکھا تھا اور آج کے دن تک تمہیں دیکھنے سے

فراغت نہں پا سکا۔ میری ریاست کے علما کرام اور عوام کا کچھ طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ میری شراب نوشی، شعروشاعری سے رغبت اور تمھارا عشق مجھے نکما اور کاہل کیے ہوئے ہے حالانکہ وہ میری شجاعت اور مردِ میدان ہونے کے بھی قائل ہیں۔ اصل میں ہم مسلمانانِ اندلس باہمی جھگڑوں اور نسلی عصبیت میں اتنے گھر چکے ہیں کہ اس گرداب سے نکلنا ممکن نظر نہیں آ رہا۔ اندلس کی مضبوط سلطنت اب کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بکھری ہوئی ہے اور عیسائی مضبوط سلطنتوں کے قدموں میں گر کے پیر چاٹ رہی ہیں۔ شاید صدیوں سے تلوار چلاتے چلاتے مسلمانوں کے ہاتھ شل ہو گئے ہیں۔ اب تلوار اٹھانے کی کسی میں سکت اور سوچ نہیں رہی۔

ایک طرف تو سارے مسلم ہسپانیہ میں عیسائی فوجیں لوٹ مار اور زبردستی مسلمانوں کو ان کے علاقوں سے نکال باہر کرنے کا سلسلہ ایک منتظم انداز سے جاری رکھے ہیں، دوسری طرف درجنوں عیسائی اور مسلمان ڈاکوں کے بڑے بڑے گروہ وجود پا چکے ہیں۔ جو دن دھاڑے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں داخل ہو کر ہر شے لوٹ کر چلتے بنتے ہیں۔ قاعدہ قانون نام کی شے نہیں رہی۔ ذرائع آمدنی ختم ہو رہے ہیں ادا کیا جانا والا خراج بڑھتا جا رہا ہے۔ امتِ مسلماں کے اس زوال اور ابتری کو کیسے روکا جائے''۔ وہ بولتا چلا گیا۔ ''شاید المریہ کی سرخ شراب دل کا بھڑاس نکالنے کے لیے تیر بہ ہدف ہے''۔ ملکہ اعتماد کی بات میں طنز کی آمیزش یا مزاح کا پہلو تھا اس نے ادھر توجہ نہ دی۔

عالم پناہ شہزادہ رشید ملاقات کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ ایک کنیز نے آ کر عرض کی۔ اُس نے جام میں بچی ہوئی شراب کا آخری گھونٹ لیا اور اسے جام وصراحی ساتھ لے جانے کا کہا۔ شہزادہ رشید کو بھیج دو اس نے رخصت ہوتی کنیز کو حکم دیا۔

وجیہہ وخوبصورت شہزادے نے ماں باپ کے ہاتھ چومے اور پھر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ اس کی سیاہ دستار پر بڑا الماس سجا تھا جس کے اردگرد قیمتی زمرد جڑے تھے۔ قرطبہ کے ریشم سے بنی وہ دستار جواہرات کی طرح چمک رہی تھی۔ بابا جان تمام سفیر اور ریاستوں کے علما نیچے دربار ہال میں

آپ کے منتظر ہیں''۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا بیٹے کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بالکونی پر لٹکتے باریک پردے کو ہٹا کر دریا کے کنارے لوگوں کی آمدورفت کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد بیٹے کے قریب آیا اور اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر اسے کہا کہ آج وہ مزید اتنے بوجھل اور دل گرفتہ موضوع پر بات کرنے کو تیار نہیں۔ کل ناشتے کے بعد ائندہ لائحہ عمل کے متعلق بات ہوگی۔ تم آج کوشش کرو کہ وہ سفیر جو افریقہ سے بربر سردار یوسف بن تاشفین کو دعوت دینے کے حق میں نہیں انہیں راضی کرنے کی کوشش کرو۔ کچھ دیر شہزادہ رشید سر جھکائے کھڑا رہا۔ ''بابا جان اگر گستاخی نہ سمجھی جائے، تو میں بھی اس حق میں نہیں کہ بربروں کو افریقہ سے مدد کے لیے بلایا جائے۔'' ''جان عزیز میں تمھارے خدشات کو سمجھتا ہوں اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ بربر اگر شاہ قشتالیہ ولیون الفانسو ششم کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں بھی شاید ہڑپ کر جائیں۔ میرے بیٹے ادھر شاید والی بات ہے اُدھر یقینی بات۔ الفانسو پوری تیاری کر چکا ہے کہ سب مسلمان ریاستوں پر قبضہ کرے۔ بڑی تعداد میں جرمن اور فرانسیسی سردار اپنے گھڑسواروں کے ہمراہ مسلمانوں سے لڑنے قشتالیہ کے جھنڈے تلے جمع ہیں۔ تم نے دیکھا طلیطلہ جیسا عظیم اور ناقابل فتح شہر پچھلے سال ہی الفانسو کے قبضے میں چلا گیا۔ ہر مسلمان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ بھیانک مستقبل سب کو نظر آ رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بشمول میرے تمام مسلمان والیانِ ریاست نے عیسائی حکمران کو سقوطِ طلیطلہ پر مبارک باد کے پیغامات بھیجے اور سیاہ بخت دن کو ایک مبارک ساعت گردانا۔ مسلمان درباری شعرا نے الفانسو کو سکندر ثانی، خدا کا نیک بندہ، محافظ دین اسلام جیسے القاب سے نوازا اور سینکڑوں قصیدے اس کی شان میں بھیجے گئے۔ کثیر تعداد میں تحائف مسلمان حاکموں نے بھیجے کہ شاید ہم اس کی غلامی سے بچ جائیں۔ اس سے زیادہ رسوائی اور ذلت میرے لیے کیا ہو سکتی ہے کہ میں نے اپنی جان سے عزیز بیٹی الفانسو کے حرم میں بھیج دی۔ شاید یہ تاریخ کا انتقام ہے۔ کئی سال گذر گئے اس مظلوم بیٹی کی مجھ تک کبھی کوئی خبر نہیں پہنچی۔ میں تمھارے اور دیگر مسلمان حکمرانوں کے اس خدشے سے آگاہ ہوں جو وہ محسوس کرتے ہیں۔''

’’لیکن میں نیچے سب کی موجودگی میں بھی کہہ چکا ہوں کہ میں افریقہ میں مسلمانوں کے اونٹ چرانا پسند کروں گا۔ قشتالیہ میں عیسائیوں کے سوروں کے ریوڑ ہانکنے کی بجائے ہم لوگوں کو اپنے ذاتی مفادات کو پس پشت ڈالنا ہوگا۔ دین اور ملت کو مقدم رکھنا ہوگا میری ریاست اور حکومت جاتی ہے تو جائے دینِ اسلام کو اندلس سے دیس نکالا نہ ملے‘‘۔

’’جانِ پدر بیٹھ جاؤ‘‘۔ اس نے شہزادہ رشید کو کہا جو بدستور سر جھکائے کھڑا باپ کی باتیں سن رہا تھا۔

اگلے دن بعد دوپہر تک یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ مسلمانانِ اندلس کی مدد کے لیے المغرب کے بربر حاکم یوسف بن تاشفین کے پاس وفد بھیجا جائے اور اسے قائل کیا جائے کہ مسلمانوں کی حفاظت کرنا عین جہاد ہے۔ چند دن بعد چار آدمیوں کا وفد جس میں اشبیلہ کے وزیر ابوبکر بن زیدون غرناطہ کے قاضی ابوجعفر، بطلیوس کے قاضی ابواسحاق اور قرطبہ کے قاضی ابن ادھم بمعہ چند غلاموں اور چھوٹے سے حفاظتی دستے کے ہمراہ اشبیلہ سے روانہ ہوکر جزیرہ الخضراء پہنچے جو المعتمد کی سلطنت کا سمندر کی جانب آخری شہر تھا۔ وہاں چند دن آرام کرنے کے بعد وفد بذریعہ بحری جہاز سبتہ روانہ ہوگیا۔ وہاں مراکش شہر میں یوسف بن تاشفین سے ملاقات کی۔ چند ضروری باتیں طے کرنے کے بعد وفد واپس چل پڑا، لیکن کچھ بے یقینی کی کیفیت تھی۔ وفد کو سمجھ نہیں آئی تھی کہ کیا یوسف نے آکر مدد کا وعدہ کرلیا ہے یا بس ان کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ لیکن چند ہفتے بعد بلا کسی اطلاع یوسف بن تاشفین کے سو جہاز جزیرہ الخضرا پر لنگرانداز ہوچکے تھے اور فوج نے اتر کر شہر کو محاصرے میں لے لیا تھا۔ المعتمد کا بیٹا راضی، جو وہاں کا حاکم تھا آمادہ جنگ ہوا لیکن باپ کے کہنے پر شہر کو بربر فوج کے حوالہ کر کے اشبیلہ راونہ ہوگیا۔

فوج کا انتظام ٹھیک کرنے کے بعد یوسف بن تاشفین اشبیلیہ کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں پڑتے ہر شہر اور پڑاؤ پر بربر افواج کے رسد اور آسائش کا پورا خیال رکھا گیا۔ المعتمد نے شہر سے باہر نکل کر یوسف بن تاشفین کا استقبال کیا۔ رات دونوں نے خیام میں شہر سے باہر بسر کی۔

اگلی صبح دلہن کی طرح سجے ہوئے شہر میں دونوں حکمران داخل ہوئے۔ المعتمد نے بربر سردار کو اتنی کثیر تعداد میں تحائف پیش کئے کہ اس کی آنکھیں حیرت سے دنگ رہ گئیں۔

الفانسو ششم کو جب یوسف کے وارِد اندلس ہونے کہ اطلاع ملی وہ ایک مضبوط مسلم شہر سرقسطہ کا محاصرہ کے پڑا تھا۔

وہ اپنے شاہی خیمے میں امرا کے ساتھ محفل ناؤنوش میں بھنے تیتر اور ہرنوں کے کباب اڑا رہا تھا جب اسے بربر سپاہ کے جزیرہ الخضرا اترنے کی اطلاع ملی۔ وہ کچھ دیر خاموش اپنے خیمے کی سرخ قنات، جس پر ریشم سے بڑے بڑے سنہری اور سفید پھول بنے ہوئے تھے تکتا رہا۔ پھر اس نے شراب کا ادھا بچا اگلاس حلق میں انڈیلا اور پہلو بدل کر فوج کے سرداروں سے مشورہ کیا۔ سب کافی مقدار میں شراب پیئے ہوئے تھے اور بغیر خوف وخطر سرقسطہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ ایسا محاصرہ جہاں محاصرین کے قلعے سے باہر آ کر ان پر حملہ کرنے کا کوئی خطرہ موجود نہ تھا۔ ''تم لوگ کیا سمجھتے ہو ہمیں کیا کرنا چاہیے''۔ حضور پر وقار کی عزت کی قسم ہم ان کمزور ہمت اور بزدل مسلمانوں کو کچا چبا جائیں گے۔ ایک نوجوان سردار نے اپنا خالی جام ساتھ رکھی صراحی سے بھرتے ہوئے کہا۔ الفانسو ہلکا مسکرایا جواب پر نہیں بلکہ اس نوجوان کی زبان کی لڑکھڑاہٹ پر۔ ''الور فانیز تمھاری کیا رائے ہے''۔ الفانسو نے اپنے ایک تجربہ کار سالار سے پوچھا جو کچھ دیر ہی قبل بلنسیہ کی ریاست فتح کر چکا تھا۔

''میرے آقا یہ افریقی بربر اندلسی مسلمانوں جیسے تن آسان کمزور اور پست ہمت نہیں، ان سے مقابلہ اچھا رہے گا اگرچہ ہماری فتح میں کوئی شک نہیں لیکن وہ سپاہی ہماری ٹکر کے ثابت ہوں گے'' الور فانیز نے اپنے کباب ختم کرنے کے بعد رکابی قالین کے اوپر رکھتے ہوئے بادشاہ کو جواب دیا۔

الفانسو نے ناراض نظر سے اپنے سالار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ دین مسیح کی قسم میں ان افریقی گڈریوں کو اندلسی بھیڑوں سمت ایسا سبق سکھاؤں گا کہ آئندہ نہ کوئی افریقہ سے آئے گا اور

نہ ہی ادھر سے کوئی کسی بد معاش کو بلا پائے گا۔ الصبح الفانسو نے حاکم سرقسطہ کو یہ پیغام بھیجا کہ اگر وہ اسے تیس ہزار سونے کی اشرفیاں دے تو وہ اسے معاف کر کے محاصرہ اٹھا کر واپس طلیطلہ چلا جائے گا لیکن حاکم سرقسطہ کو بھی معلوم تھا کہ یوسف بن تاشفین اندلس میں وارد ہو چکا ہے اور وہ الفانسو پر حملہ کرنیوالا ہے۔ اس نے ایک ایلچی الفانسو کے پاس بھیجا جس نے آ کر اسے پیغام دیا کہ وہ جتنی دیر چاہے شہر سے باہر بیٹھا رہے اسے ایک درہم خیرات میں بھی نہ دیا جائے گا۔ اگلے دن ہی الفانسو محاصرہ اٹھا کر چلتا بنا، بلکہ اس نے بلنسیہ میں بھی اپنی متعین فوج کو واپس طلیطلہ میں طلب کر لیا۔ جلیقیہ، لیون اور قشتالیہ سے اپنی افواج کو فوراً دارالحکومت میں طلب کیا اور خود بھی تیز رفتاری سے اپنے دارالحکومت کو پلٹ گیا۔

''میرا یہ خیال ہے کہ ہمیں میدان جنگ کا انتخاب بڑے سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے'' الفانسو نے اپنی سمور کی ایک بڑی پوستین کو اپنے گرد سمیٹے ہوئے کہا۔ موسم کافی خنک تھا دو دن سے مسلسل ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ''اگر ہم اپنے دارالحکومت میں ٹھہر کر مسلمانوں کا انتظار کریں تو یہ کافی خطرناک ہوگا کیونکہ وہ اس شہر تک کا سارا علاقہ اجاڑ دیں گے اور اگر ہمیں شکست ہوگئی تو پھر شہر کا کوئی ذی روح زندہ نہیں بچ پائے گا۔ اگر ہم ان کے علاقے کو میدان جنگ چنیں تو شکست کی صورت میں ہماری آبادی محفوظ رہے گی اور ہماری فتح کی صورت میں ہم ساتھ واقع ریاستوں کو فوراً فتح کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے''۔

چند دن بعد اسے اطلاع ملی کہ مسلم لشکر جن کی تعداد تقریباً بیس ہزار ہے وہ طلیطلہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اسی دن حکم دیا گیا کہ کل مسلمان ریاست بطلیوس کی جانب کوچ کیا جائے گا۔ وہ ریاست راستے میں تھی۔ روانگی سے قبل اس نے اپنے لشکر کا معائنہ کیا جو شہر کے نزدیک تیار کھڑا تھا۔

اکتوبر کا دوسرا ہفتہ ختم ہو رہا تھا۔ نیلے آسمان پر جا بجا سرمئی بادلوں کے ٹکڑے کہیں جامد اور کہیں حرکت میں تھے۔ اس وقت بادل کے ایک بڑے ٹکڑے نے سورج کے منہ پر نقاب ڈال

رکھا تھا، جس کے سبب خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ ہر سپاہی کی خواہش تھی کہ وہ ٹکڑا سورج کے راستے سے ہٹ جائے اور شفاف دھوپ ہر جانب پھیل جائے۔ ایک چھوٹے ٹیلے پر الفانسو ششم شاہی لباس میں ہتھیار بند، خوبصورت جسیم گھوڑے پر سوار تھا۔ دور دور تک میدان میں اس کی فوج کے سوار اور پیادہ پرا جمائے کھڑے تھے۔ جہاں بادل حائل نہ تھے وہاں لمبے نیزوں کے پھل اور سروں پر رکھے فولادی خود چمک رہے تھے۔ بیشتر سپاہی آہن پوش تھے۔ لشکر کی تعداد تقریباً پچاس ہزار کے قریب تھی۔ جو شاہ لیون، قشتالیہ، جلیقہ وطلیطلہ کو سامنے سوار دیکھ کر جوش میں نعرے لگا رہے تھے۔ اس کا سر فخر اور خود اعتمادی سے اور تن گیا۔ پہلو میں سوار ایک سالارِ لشکر کو جو اس کا بچپن کا دوست اور کافی بے تکلف تھا اسے مخاطب ہو کر پوچھا کہ آیا اس نے اس سے قبل ایسی زبردست اور بہترین سلاح جنگ سے لیس کوئی سپاہ دیکھی ہے۔ اور خود ہی جواب دیا یقیناً نہیں دیکھی ہو گی۔ حضور کا اقبال اور بلند ہو ایسی بے مثل فوج فقط آپ جیسے یکتا، بے بدل اور بلند بخت بادشاہ ہی کو میسر آ سکتی ہے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد الفانسو نے کہا کہ اس عظیم لشکر سے میں ساری دنیا فتح کر سکتا ہوں۔ یہ بے وقعت مسلمان کیا ہیں، اگر میرے لشکر کے مقابل جن اور فرشتوں کی فوج بھی ہو تو شکست کھا جائے۔ اس نے تکبر سے اپنے سالار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بطلیوس شہر کے قریب متحد اسلامی لشکر نے پڑاؤ ڈالا لیکن بیشتر سپاہی یوسف بن تاشفین ہی افریقہ سے لایا تھا۔ اس کا لشکر تقریباً پندرہ ہزار دیو قامت بربروں پر مشتمل تھا۔ کئی سالوں سے جان توڑ تربیت اور افریقہ میں جنگی تجربوں نے انہیں صف شکن اور ناقابل شکست لشکر میں بدل دیا تھا۔ وہ ایک مشین کے کل پرزوں کی طرح یکجا باہمی اور مربوط انداز سے جنگ لڑتے تھے۔ ایسا تجربہ ہسپانیہ میں مسلم یا عیسائی افواج کو نہ تھا اسی سبب یوسف بن تاشفین نے فیصلہ کیا کہ اشبیلیہ غرناطہ اور بطلیوس سے آئے لشکر جن کی مجموعی تعداد پانچ ہزار کے قریب تھی وہ اس کے لشکر سے علیحدہ عیسائیوں پر حملہ آور ہوں گے یا ان کے حملے سے اپنا دفاع کریں گے۔ یوسف بن تاشفین

اپنے درجن بھر سواروں کو ساتھ لے کر اپنے لشکر گاہ سے نکلا اور بطیوس کی ایک جانب دور واقع ایک میدان کی طرف گھوڑے کو دوڑاتا لے گیا۔ وہ میدان شہر سے تقریباً چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا۔ اپنے ہمراہ آئے سردار سے کچھ دیر مشورہ کرنے کے بعد اس نے اسی میدان کو جنگ کے لیے منتخب کیا۔ اگلے دن اس نے اپنے لشکر کو وہاں خیمہ زن ہونے کا حکم دیا۔ اس جگہ چند پہاڑیاں بھی واقع تھیں۔ دو دن بعد الفانسو ششتم اپنے شاندار لشکر کے ساتھ مسلمان فوج سے تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر سامنے اتر پڑا۔ اگلے دن اسلامی دستور کے مطابق یوسف نے اسے ایک خط بھیجا جس میں تحریر تھا کہ وہ عیسائیت ترک کر کے دینِ اسلام کو اختیار کرے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی حفاظت میں آ کر جزیہ ادا کرے، اگر دونوں صورتیں قبول نہیں تو جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ خط پڑھ کر وہ مغرور بادشاہ آگ بگولہ ہو گیا اس نے اپنے لشکر میں موجود عربی لکھنے والے خط نویس کو بلایا اور انتہائی برے الفاظ میں خط تحریر کروایا۔ جس میں یوسف بن تاشفین کو صحرائی ڈاکو اور بزدل گڈریا کہہ کر مخاطب کیا اور اسے نصیحت کی کہ وہ فوراً جان بچا کر افریقہ چلا جائے اور ان مسلمانوں کو جو حقیقتاً اب اس کی رعایا اور باجگزار ہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا انجام عبرتناک ہوگا۔ المعتمد کے انشا پرور نظم کی صورت میں خط کا جواب لکھنے لگے یوسف نے حیران ہو کر پوچھا کہ اتنا لمبا خط کیا لکھ رہے ہو کاتب نے کہا کہ میں موزوں شعر منتخب کر کے لکھ رہا ہوں۔ یوسف بن تاشفین نے ناراض ہو کر اس کا لکھا ہوا خط پھینک دیا اور الفانسو کے خط کے پیچھے اپنے ہاتھ سے چند لفظ تحریر کر دیئے ”جو ہونے والا ہے تم خود دیکھ لو گے“

اپنے خط کی پشت پر لکھے یوسف بن تاشفین کے جواب کو دیکھ کر الفانسو کی ہڈیوں میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی خط ایک طرف رکھتے ہوئے وہ ہولے سے بولا میرا مقابلہ ایک بہادر اور نڈر آدمی سے ہونے والا ہے۔ اس زمانہ کا طریقہ جنگ تھا کہ لڑائی کا آغاز فریقین کی مرضی کے دن سے ہوتا الفانسو نے کہلا بھیجا کہ آج جمعرات کا دن ہے کل جمعہ تمھارا مقدس دن ہے اور اتوار ہمارا اس لیے مناسب ہے جنگ ہفتہ والے دن شروع کی جائے۔ جس سے یوسف بن تاشفین نے اتفاق کیا

لیکن المعتمد نے اسے متنبہ کیا کہ الفانسو مکاری سے کام لے رہا ہے۔ یہ یقیناً جمعہ کو ہی ہم پر حملہ کرے گا اس لیے ہمیں پوری طرح تیار ہونا چاہیے۔ جنگی منصوبہ بندی کے مطابق اندلسی افواج ہراول کا کام کر رہی تھیں اور ان کے ذمہ عیسائی پہلے ہلے سے نبٹنا اور اسے واپس دھکیلنا تھا۔ رات کے وقت المعتمد کے کئی سو سوار اپنے لشکر گاہ سے اگے کچھ فاصلے پر تعینات تھے اور انہیں ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا۔ اس کا شک درست نکلا پو پھٹنے سے قبل اس کے چند سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے اور عیسائی لشکر کی دبے پاؤں پیش قدمی کی اطلاع دی۔ اندلسی فوج فوراً تیار ہو کر میدان میں جم گئی اور ساتھ ہی انہوں نے یوسف کو پیغام بھیجا کہ الفانسو کا پورا لشکر بڑھا چلا آ رہا ہے آپ بھی ہماری مدد کو آئیں۔ افریقی لشکر کہیں نظر نہ آ رہا تھا المعتمد کا جسم پریشانی اور ہراس سے ٹھنڈا ہونے لگا۔ عیسائی فوج اس کے لشکر سے دس گناہ زیادہ تھی۔ اس نے ہمت سے کام لینے کا فیصلہ کیا اور اپنے سفید خوبصورت عربی گھوڑے کی گردن کو پیار سے تھپتھپا کر سوار ہو گیا۔ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر کے اندلسی رسالہ اور پیدل سپاہ خم ٹھونک کر کھڑی ہو گئی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ اندلسی سپاہ مردانگی سے لڑ رہی تھی یہ بات عیسائیوں کے لیے ناقابل یقین تھی۔ جب مسلمان لشکر پر دباؤ بڑھ گیا تو المعتمد نے دوبارہ مدد کے لیے یوسف بن تاشفین کے طرف گھڑ سوار کو دوڑایا۔ الفانسو کی آہن پوش سپاہ سے مقابلہ آسان نہ تھا اور اس بے جوڑ معرکے سے گھبرا کر اکثر بطلیوسی اور غرناطہ کے لشکری راہ فرار اختیار کر گئے، لیکن لشکر کی اگلی صفوں میں لڑتے ہوئے المعتمد اپنی سپاہ کو لے کر جما رہا۔ اس کے چہرے اور سر پر کئی زخم آئے، دوران جنگ اس کے تین گھوڑے ہلاک ہوئے، لیکن اس کے پائے استقلال میں لرزش نہ آئی۔ کچھ دیر بعد افریقی بربروں کا ایک بڑا دستہ ان کے ساتھ جنگ میں شامل ہو گیا اب وہ جنگ اتنی بے جوڑ نہ رہی۔

یوسف بن تاشفین نے پہاڑی کو پیچھے سے عبور کیا اور الفانسو کے عقب لشکر اور اس کی خیمہ گاہ پر اس شدت کا حملہ کیا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ابن تاشفین بربروں کے جوش بڑھانے کو بار بار نعرہ تکبیر بلند کر رہا تھا۔ ''کوئی کافر تم سے بچ کر بھاگ نہ پائے'' وہ بار بار انہی الفاظ کو دہراتا

دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہا تھا۔

جنگ زلاقہ کی آگ پوری بھڑک اٹھی تھی۔ بربر ہلکی زرہ بکتر اور کھلی عباؤں میں اپنی بھاری خمدار تلواریں چلاتے اور قبائلی و مذہبی نعرے لگاتے کوئی اور ہی مخلوق لگ رہے تھے۔ ان کے سوار اور پیادے اتنے منظم انداز میں رخ بدل بدل کر حملہ آور ہوتے کہ دشمن کو ان کے انداز جنگ کی کوئی سمجھ نہ پڑی۔ قشتالوی سپاہیوں کے لمبے اور بھاری نیزوں کے مقابلے میں بربروں کے چھوٹے بھالے بہت کارآمد ثابت ہوئے اور ان کے دشمن پر دور سے پھینکے گئے برچھوں سے ہزاروں گھڑسواروں کے گھوڑے اپنے سواروں پر سوار مردہ پڑے تھے۔ الفانسو نے جب اپنے عقب لشکر کو یوں برباد ہوتے دیکھا تو اپنے قلب کے ہمراہ ان کی مدد کو پیچھے پلٹا۔ الفانسو کو پلٹا دیکھ کر ابن تاشفین نے اپنے ان بلند قامت سیاہ فام گھڑسواروں کو حملے کا حکم دیا جو تازہ دم تھے اور ابھی تک جنگ میں شامل نہ ہوئے تھے ان کے حملے نے الفانسو کے قلب لشکر کی پشت پر حملہ کیا اور اس کو روندتے ہوئے عقب تک پہنچ گیا وہ بلا کے تیرانداز اور شمشیرزن تھے۔ ان کے جتھے حملہ کرتے ہوئے ایسے لپکتے جیسے آبی پرندوں کے غول سینکڑوں کی تعداد میں یک دم اور اکٹھے اپنا رخ بدلتے ہیں۔ سارے میدان میں چھوٹے بھالے اور فولادی برچھے۔ عیسائیوں کے سینے چھید رہے تھے۔ بربر برچھا پھینکنے میں اتنے ماہر تھے کہ بھاگتے گھوڑے کے سوار کی گردن سے ترازوں ہو جاتا اور اگلے لمحے گھوڑا حیران کھڑا زمین بوس سوار کو دیکھ رہا ہوتا۔

میدان زلاقہ قشتالوی لیونی اور فرانسیسی جنگجوؤں کی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ 23 اکتوبر 1086ء کے سورج نے جب اپنی آخری نظر جنگ زلاقہ کے میدان پر ڈالی تو مغرور اور خودسر الفانسو اپنے ران کے زخم کو ایک ہاتھ سے دبائے میدان سے فقط چند سواروں کے ہمراہ فرار ہو رہا تھا۔ مسلمان لشکر عظیم کامیابی حاصل کر چکا تھا۔

چند دن بعد جب تھکا ہارا دل گرفتہ طلیطلہ کے دروازے کے پاس پہنچا تو اس کا بچپن کا دوست سالار بھی اس کے ہمراہ جان بچانے میں کامیاب ہو کر اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ نیچے پہاڑ کی

گھاٹی پر دریائے ٹاگس کے پل اور اس سے پار سینکڑوں تھکے ہارے زخمی سوار اور پیادہ سر جھکائے شہر کی طرف شکست خوردہ چلے آ رہے تھے۔ تیز دھوپ تھی۔ نیلا آسمان بالکل صاف تھا لیکن الفانسو کو ہر طرف اندھیرا سا نظر آ رہا تھا۔ حضور والا، جان کی امان پاؤں تو کیا ایک بات پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔ ہاں پوچھو الفانسو نے آہستہ سے کہا۔ میرے آقا، ''ہم تو فرشتوں اور جنوں سے مقابلہ کیے بنا ہی ہار گئے''۔ ''میں نے جن اور فرشتوں کی بات کی تھی۔ کیا یہ جن اور فرشتے تھے۔ میرے خدایا! کیسی جنگ تھی وہ۔ وہ بھوت تھے خونخوار افریقی بھوت، مجھے کچھ سجھائی نہ دیا۔ سوچ اور سمجھ معطل ہوگئی۔ میرے دیکھتے دیکھتے اس عالیشان فوج کو انہوں نے خاک وخون میں غلطاں کر دیا۔ کیا جواں سال لوگ تھے۔ کیا سجیلے اور خوش رو تھے وہ جواں مرد، کہاں کہاں سے آئے تھے فتح کی امید میں دینِ مسیح کے استحکام کے لیے، افسوس ان عفریتوں نے سب برباد کر دیا۔ میرا سارا لشکر وہ عفریت چٹ کر گئے۔ کھایا ہوا بھوسہ بنا کے رکھ دیا''۔ زخمی لشکریوں کی لمبی قطار پر نیچے نظر ماری۔ خوف زدہ انکھوں کو چند لمحے بند کیا، اور پھر گھوڑے کی لگام اپنے محل کی جانب موڑ دی۔

پتھر چہرے
(افسانے)

○

''یقیناً ان کا تعلق جنوں کے گروہ سے نہ تھا وہ تمہارے ہی ہم جنس تھے۔ انسان تھے تربیت یافتہ تو میرے ہی تھے لیکن انسانی سپوت تھے میری امیدوں سے آگے نکل گئے ہیں۔ میں تمہیں کچھ دیر پہلے بتا رہا تھا کہ انسان کی سب سے بڑی خوبی اور میری پسندیدہ صلاحیت اس کی جھوٹ اور سچ میں فرق نہ کرنے کی عادت ہے۔ وہ ظلم کرنے کے بعد اس کو جائز سمجھنے لگتا ہے اور کچھ دیر بعد اسے انصاف اور حق تسلیم کر لیتا ہے جھوٹ کو سچ مان کر اس پر ایمان لے آتا ہے لیکن اگر اس کا مفاد وابستہ ہو تب ایسا کرتا ہے۔''

○

''تم ٹھہرے خاندانی رئیس، تمہیں چھوڑ تمہارے دادا کو بھی کبھی فکرِ معاش نہ رہی ہو گی۔ تمہیں کیا خبر یہ کیسی بڑی بلا ہے۔ تم نے کبھی کسی تنو مند اور بھرپور درخت پر آکاس بیل چڑھی دیکھی ہے جو اسے مکمل ڈھانپ لیتی ہے، کہیں سے سبزہ نظر نہیں آنے دیتی، فقط اسی کا زرد رنگ ہر جانب ہوتا ہے۔ غریبی بھی ایسی ہی چیز ہے۔ ہر مسرت و خوشی پر چڑھی ہوئی آکاش بیل۔ کاش انسان افلاس کو ہلاک کرنے کا طریقہ ڈھونڈ لیتا تو اسے زندگی مل جاتی، ابھی تو فقط عمر گزار رہا ہے۔

○

یہ عیاش کچھوا، خبیث آمون حوتپ، دیوتاؤں کو ملنے والے
زر و جواہر، بیل گندم، جو، کنیزیں، غلام سب ہڑپ کر
جائے تب بھی آمون را، خپ را، آسر، آئست اور انوبس کا نمائندہ
رہے اور میں غریب دو روٹیوں کے بدلے جہنم میں۔ لعنت ہو سب پر۔
وہ غصے سے کانپنے لگا۔ یہ مذہب کے تاجر روحوں کا خون پیتے ہیں یہ
استحصال کے دیوتا ہیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف دیکھے بغیر
معبد کی مرکزی عمارت کی جانب چل دیا۔ کچھ دور جانے کے
بعد مڑ کر میری جانب دیکھا اور چلایا۔ ”یہ گروہ کبھی انسان کو
سکون اور اطمینان سے جینے نہیں دے گا۔“

Price Rs. 160/-